www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جنوری 2018

یومِ جمہوریہ مبارک

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

اردو دنیا

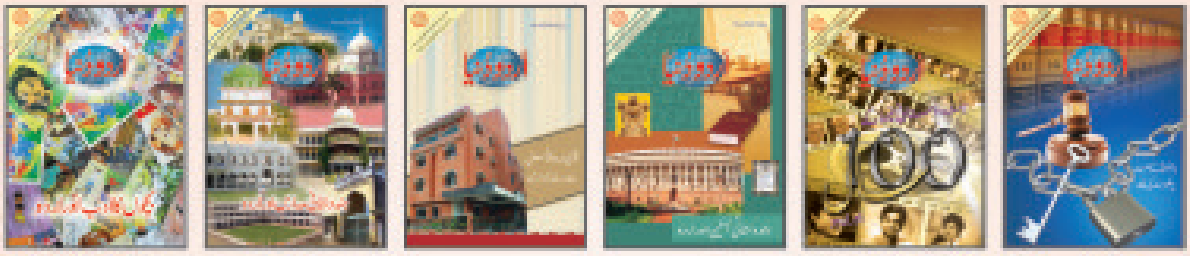

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے: اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

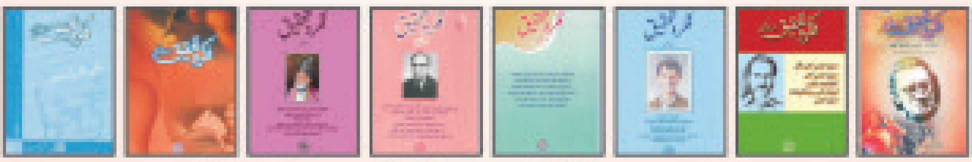

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 1 جنوری 2018

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں
نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ
مکالمہ — مدیر — 4

روبرو
امریتا پریتم سے مجیب صدیقی کی گفتگو — 5

شخصیت
مادر ہمدرد رابعہ بیگم — انور ادیب — 11

محفلِ سخن
شاعرات کے منتخب اشعار — 13

جہانِ نسواں
فیمنزم اور نذیر احمد کے ناولوں کی عورت — صبیحہ ناہید — 14
عہد ساز فکشن نگار قرۃ العین حیدر — ثنا اسد — 16
زاہدہ زیدی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت — عذرا النقوی — 14
دیہی خواتین: خود مختاری...... — محمد اعجاز — 22

قانون میں خواتین
خواتین کے خلاف خانگی تشدد........ — خواجہ عبدالمنتقم — 24

کہانیاں
گودلی ہوئی میں — افشاں ملک — 28
جستجوئے زندگی — شہربانو — 32
تبسم زیرِ لب — شفیقہ فرحت — 35
پر کٹنے کے بعد — مہناز انور — 38
ہمراہی اور منزل — چشمہ فاروقی — 42
اللہ کی مرضی — پروین طلحہ، مترجم صبیحہ انور — 44

حسنِ سخن
ناہید خانم 50، سمیرہ عزیز 50، صاحب شہر یار 51

باورچی خانہ
لذیذ پکوان — 52

صحت
سبز چائے: فائدے اور استعمال — انصاری اسماء — 54

آرائش و زیبائش
حسن کی نگہداشت — 57
تاثرات — 59
خواتین خبرنامہ — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقام اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025 فون: 49539000
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، قمرالنسا، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار گلی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

یوم جمہوریہ اور نئے سال کی مبارکباد کے ساتھ 'خواتین دنیا' کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے یقیناً اس نئے سال میں ہمارے جمہوری عزائم مزید مستحکم ہوں گے۔ ملک میں ترقی کی رفتار تیز ہوگی، خواتین مضبوط اور طاقتور بنیں گی، جہالت کا خاتمہ ہوگا اور تمام انسانوں کے وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے جو انھوں نے اپنی آنکھوں میں پال رکھے ہیں۔ ہم ماہ در ماہ آگے بڑھ رہے ہیں ہماری اولین ترجیحات میں وقت مقررہ پر شمارے کو تیار کرکے پیش کرنا ہے وہ ہم کر رہے ہیں اب آپ کے لیے یہ سوال ہے کہ کیا خواتین دنیا اس خلا کو پُر کرنے میں کسی بھی حد تک کامیاب رہا جس کی ضرورت تھی اور جس کے لیے اس کا اجرا کیا گیا تھا؟ کیونکہ اراکین کونسل کے مضبوط دلائل تھے کہ ہمارے معاشرے کی ترقی کا انحصار خواتین کی ترقی سے مشروط ہے اور اگر اس معاشرے کو ترقی کی رفتار دینی ہے تو اس کے ایک پہیے کو یکسر نظر انداز کرنے سے یا کسی حد تک محدود کر دینے سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں اور معاشرہ ہو یا معاشرے میں بولی اور لکھی جانے والی زبان، خواتین کے بغیر اس کی ترقی و ترویج ممکن نہیں۔ اس سے بھی ہمیں انکار نہیں کہ ظلم و تشدد، قتل و غارت گری جور و ستم، دہشت گردی و وحشت نا کی اس کا شکار سب سے زیادہ خواتین ہی ہوتی ہیں چاہے وہ آزاد و خود کفیل عورت ہو یا پھر ماں، بیوی، بیٹی اور دیگر رشتوں کی ڈور سے بندھی ہوئی عورت۔ اس کے مقدر کا خدا مرد اساس سماج ہی ہوتا ہے ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ باتیں نئی ہیں یا ان مسائل کو لے کر سنجیدہ کوششیں نہیں ہو رہی ہیں۔ عالمی پیمانے پر اب عورتیں بیدار ہو چکی ہیں اور ہر ملک میں اس میدان کارزار میں خواتین جی جان سے لڑ رہی ہیں تاکہ اللہ کی اس مخلوق کی صلاحیتوں سے ایک پر امن ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کی جا سکے اور اس میں انھیں کامیابیاں بھی حاصل ہو رہی ہیں لیکن ان سب کے درمیان افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ اردو معاشرے پر جمود طاری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس معاشرے کی خواتین کے سامنے آج بھی میکے سے نقل مکانی کرکے سسرال آنے کا المیہ، ساس بہو کے درمیان کی کشیدگی، روتے بسورتے بچوں اور ان کی پرورش کے لیے وسائل کی عدم فراہمی یا پھر عشق و محبت کے درمیان در آنے والی معاشرتی دیواریں ہی سب سے بڑے مسائل ہیں۔ خواتین دنیا اس سے آگے کی منزل کو سر کرنے کی اولین جدوجہد کا پلیٹ فارم ہے ہماری کوشش ہے کہ عالمی سطح پر دوسری دنیا اور دوسرے ترقی یافتہ سمجھے جانے والے معاشرے میں درپیش مسائل کی روشنی میں ہم اپنے معاشرے کے مسائل کو خوردبین لگا کر دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ آیا ہم ترقی یافتہ ممالک کی خواتین کے مقابلے کس قدر پست ہمت ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونا یا نہ ہونا ایک بات ہے لیکن ہم نے اپنے معاشرے کی عورتوں کو وہ اہمیت ہی نہیں دی جس کی وہ حقدار تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی گود میں پل کر جو نسل جوان ہو رہی ہے وہ حقوق کا مطالبہ تو کرتی ہے لیکن اپنے فرائض کا ان میں رتی بھر بھی احساس نہیں۔ ہمیں غور کرنا ہوگا کہ آخر 19 ویں صدی کے اواخر سے جن خواتین نے اردو ادب کے دامن کو اپنے خیالات و احساسات سے گرمانا اور برمانا شروع کیا تھا آج اکیسویں صدی میں بھی خواتین ادیبوں کی کمی کیوں محسوس ہوتی ہے۔ کیوں ہمارا ادب آج بھی خواتین تنقید نگاروں، محققوں اور اچھی شاعرات سے خالی ہے۔ ہمارے معاشرے کے جدید مسائل سے آنکھ ملانے والی خاتون قلمکار کیوں نظر نہیں آتیں۔ 'خواتین دنیا' ان سارے سوالات کا حل پیش کر سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ سوچنے اور فکر کرنے والی خواتین اپنے قلم کو تیشہ بنا لیں اور ڈھیروں مسائل کے پہاڑ پر ایسی کاری ضرب لگائیں کہ مجلتی اور اخلاقی ہوئی امن و سکون کی ندی ہمارے خشک ہو رہے ادبی میدان کو سرسبز و شاداب کر دے۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

امریتا پریتم سے مجیب صدیقی کی گفتگو

شہرۂ آفاق ناول نگار، شاعرہ، کہانی کار اور ترقی پسند ادیب امریتا پریتم اردو، ہندی اور پنجابی کی نامور اور مستند تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کی سنجیدہ قاری بھی تھیں اور مترجم و نقاد بھی۔ مجیب صدیقی سے بات چیت میں ان کی زندگی، شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو اردو سروس سے نشر ہو چکا ہے جسے شکیل اختر نے اپنی کتاب "روبرو" میں شامل کیا ہے۔ ہم اسے شکیل اختر کے شکریے کے ساتھ خواتین دنیا میں اس لیے شائع کر رہے ہیں تا کہ موجودہ عہد کی خواتین امریتا پریتم کے مزاج و منہاج سے استفادہ کر سکیں۔

مجیب صدیقی: اس وقت امریتا پریتم جی ہماری دعوت پر اسٹوڈیو میں تشریف رکھتی ہیں، ہمارے سامعین سے کچھ گفتگو کرنے کے لیے تا کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے فن کے بارے میں ہمارے سننے والوں کو یہ براہ راست خود بتا سکیں۔ امریتا جی ایک طویل مدت سے ہمارے سننے والے اور خود میں ذاتی طور پر کہوں کہ آپ کو پڑھتے آ رہے ہیں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر سنتے آ رہے ہیں۔

امریتا پریتم: مجیب صاحب آپ کی مہربانی اور سننے والوں کی مہربانی۔

مجیب صدیقی: اب مہربانیاں آپ کہیں امریتا جی یا یہ اشتیاق ہے ہمارا آپ کے تئیں۔ آپ کا فن ہی ایسا ہے۔ اتنا پر کشش ہے کہ اُسے سنے بنا، یا پڑھے بنا رہا نہیں جاتا۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا امریتا جی کہ ایک سوال بہت دنوں سے میرے ذہن میں گونج رہا تھا جسے میں آپ سے بھی پوچھنا چاہتا تھا۔

امریتا پریتم: جی۔

مجیب صدیقی: ہماری جتنی بھی خاتون لکھنے والی ہیں۔ میں ہندی، اردو اور پنجابی کی بات کر رہا ہوں۔ کچھ خاص خاص نام اس وقت میرے ذہن میں ہیں۔ مثلاً منو بھنڈاری، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی اور آپ امریتا پریتم۔ آپ سب کی تحریریں پڑھ کر ہم نے یہ محسوس کیا کہ ایک خاتون ہونے کے ناطے جب آپ افسانے لکھتی ہیں یا ناول لکھتی ہیں تو آپ کی ایک شعوری کوشش ہوتی ہے، جانی بوجھی کہ آپ کچھ ضرورت سے زیادہ بے باک ہوں۔

امریتا پریتم: نہیں مجیب صاحب! ایسا نہیں ہے۔ میں جیسی ہوں ویسا ہی لکھتی ہوں۔ میں طبیعتاً بے باک ہوں۔ یہ میری کوئی شعوری کوشش نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: یہ شعوری کوشش نہیں ہے تو ہم کو ہر ایک لکھنے والی خواتین میں، بڑی بڑی رائٹر میں ایسا نظر آتا ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی کو دیکھ لیجیے۔

امریتا پریتم: میں کسی اور کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا چاہوں گی۔ اپنے بارے میں صرف کہہ سکتی ہوں جو جیتی ہوں وہی لکھتی ہوں۔ زندگی اور فن میں فاصلہ نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: مطلب! ایسا آپ کا مقصد ہے۔ اچھا آپ نے جب لکھنا شروع کیا ایسا کیوں محسوس کیا امریتا جی اور ایک خدا داد صلاحیت جو بچپن ہی سے آپ کے ذہن میں تھی اور بچپن اور لڑکپن سے ہی وہ ناتراشیدہ صنم کلبلا رہے ہوں گے، آپ نے جنھیں تخلیق بخشی۔ آپ نے کسی مشن کے تحت لکھنا شروع کیا۔

امریتا پریتم: اس کو ایک لفظ میں کہتا ہو مجیب صاحب۔ یہ سوال میں نے بھی خود سے پوچھا تھا اور خود ہی جواب دیا۔ اسے کچھ ایسے کہہ سکتی ہوں کہ

گنگا جل سے لے کر واڈکا تک
یہ سفر نامہ ہے مری پیاس کا

یہ جو پیاس تھی زندگی کی۔ پتہ نہیں کیا تھی۔ بہت چھوٹی تھی جب لکھنا شروع کیا۔ آپ کو شاید حیرت ہوگی کہ میں نے پہلی نظم جو لکھی اس کے بدلے میں ایک چپت ملی تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی تو ایک محبت کی نظم لکھ کر دی۔ ظاہر ہے کہ ایک ذہنی خیال ہوگا زندگی میں تو کچھ نہیں تھا۔ باپ نے پوچھا کہ یہ نظم تم نے لکھی ہے۔ انھوں نے کہیں دیکھ لی تو میں نے انکار کر دیا ڈر گئی تھی۔ بہت چھوٹی تھی تو میں نے کہا میں نے نہیں میری سہیلی نے لکھی ہے تو انھوں نے پہچان لیا اور ایک چپت لگائی اور یہ کہا

کہ جھوٹ بولتی ہو۔ تو ایسا لگا کہ جیسے نظم نے بھی جھوٹ کو برداشت نہیں کیا۔ وہ پھر سے میرے نام پر لگ گئی۔ اس میں ایک لفظ استعمال کر لیا تھا راجن۔ راجن کوئی نہیں تھا زندگی میں۔ میں نے نام بھی Amendment کر لیا تھا۔ تو یہ سفر وہاں سے شروع ہوا تھا۔

مجیب صدیقی : آپ نے جس پیاس کا تذکرہ کیا وہ پیاس تو آپ کی ذاتی تھی لیکن پھیلا دیا آپ نے تمام عالم پر اور اس پیاس کا احاطہ ہو گیا۔

امریتا پریتم: اسے کہہ سکتی ہوں مجیب صاحب کہ اپنے سے آگے، اپنے تک کا، ایک سفرنامہ ہوتا ہے۔ ایک پہنچنے کی کوشش، اپنے سے آگے، اپنے تک۔ تو اس کا مطلب ہے کہ خود سے لے کر کل عالم تک جس میں ہم پہچان پاتے ہیں دوسرے کی پیڑ حا کو بھی دوسرے کے درد کو بھی۔

مجیب صدیقی : آپ کی اس پیاس کو پڑھ کر دوسروں کی پیاس بھی محسوس ہوتی ہے ایسا آپ نے سمجھا۔

امریتا پریتم : لکھنے کی بات تو کہہ سکتی ہوں۔ اکیلے میں لکھنے والی ہوتی ہوں اور اکیلی پڑھنے والی بعد میں یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خود کو Identify کرتے ہیں اس سے۔

مجیب صدیقی :اس کے لیے آپ اپنی طرزِ تحریر کو کریڈٹ دیتی ہیں۔ یہ سمجھتی ہیں کہ میری لیکھن شیلی میں اتنی طاقت ہے۔

امریتا پریتم: نہیں مجیب صاحب شیلی تو آتی ہے خیالات کے مطابق اگر خیالوں میں زور ہو اگر کہنے کی شدت ہو تو وہ شیلی اپنے آپ آتی ہے۔ اور ظاہراً یہ کوشش نہیں ہوتی کہ یہ لوگوں تک پہنچے۔

مجیب صدیقی: تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ اپنے لیے اپنی خاطر لکھتی ہیں۔

امریتا پریتم : آپ سے میں نے کہا نا کہ اس کو پڑھنے والی پہلی خود میں ہوتی ہوں بعد میں اس میں شمار ہوتے ہیں اور لوگ۔

مجیب صدیقی :جب لوگوں کا اس پر اچھا یا برا جو بھی اثر پڑتا ہے۔ اس سے آپ کو کیسا لگتا ہے۔

امریتا پریتم: مجھے جتنے پاٹھک مل جائیں۔ سچ سچ اگر پہچان کے ماڈھم سے ملیں تو اچھا لگتا ہے۔ نہیں پہچان پاتے تو کوئی شکوہ نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کے جو قاری یعنی پاٹھک ہیں وہ آپ کے فن کو پڑھنے کے بعد صرف فن تک آپ کو پہچانیں یا آپ کی شخصیت یا آپ کی ذات میں وہ تلاش کرے۔

امریتا پریتم: نہیں قدر و قیمت تک۔

مجیب صدیقی: صرف اقدار تک۔

امریتا پریتم: Values جو ہیں اگر ہم ان کو چھوڑ دیں تو فن کچھ بھی نہیں میری نظر میں۔

مجیب صدیقی: تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ تمام Values کو قدروں کو، اقدار کو پیش نظر رکھ کر اپنے فن کی تخلیق کرتی ہیں۔

امریتا پریتم : وہ مجھ میں ہے۔ ان کو خاص طور پر مجھے اپنے سامنے رکھنا نہیں پڑتا۔ یہ میرا ایک نظریہ ہے میری زندگی میں رچا بسا ہوا۔

مجیب صدیقی: تو وہ پھر نظریاتی شاعری ہو گی۔

امریتا پریتم: آپ کہہ سکتے ہیں۔

مجیب صدیقی : نظریاتی شاعری سے میری مراد یہ ہے کہ کسی مخصوص نظریے کو سامنے رکھ کر شاعری کی جائے۔؟

امریتا پریتم: نظریے تو تجربے کے ساتھ بدلتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں۔ وشال ہوتے ہیں تو ان کی ایمانداری اسی میں ہے کہ جیسا آپ سوچتے ہیں ویسا لکھیں۔ ویسا جئیں اور ویسا لکھیں۔ میرے لیے جینے کی اور لکھنے کی قدر و قیمتیں الگ الگ نہیں ہیں۔

مجیب صدیقی: آپ کے اس سوال سے بات کچھ ہٹ گئی ورنہ میں سیدھے سیدھے یہ کہنے والا تھا کہ آپ کی شاعری بھی کچھ نظریات کے دائرے میں محدود ہے۔ وہ نظریہ اچھا ہے یا برا ہے اس سے ابھی مراد نہیں ہے۔

امریتا پریتم : نظریہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن دھرتی آسمان تک محدود ہے بھی کہہ سکتے ہیں۔

مجیب صدیقی : اس قسم کا نظریہ کبھی آپ کے سامنے رہا جیسے اصلاحی، سماجی۔ آپ نے کبھی یہ سوچ کر لکھا کہ ہم سماج میں کچھ اصلاح کریں اپنے قلم کے ذریعے جیسے بہت سے دانشوروں نے سوچا۔

امریتا پریتم : دیکھیے مجیب صاحب میرا اس طرح کا نظریہ نہیں ہے کہ سماج کو تھوڑا سا بدل دیں اس کے نظریے کو بدل دیں ایسا نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ ان چیزوں سے انسان ذاتی طور پر بڑا نہیں ہوتا۔ سماج سے بڑا نہیں ہوتا شہرت سے بڑا نہیں ہوتا۔ پیسے سے بڑا نہیں ہوتا۔ طاقت سے بڑا نہیں ہوتا انسان چھوٹا رہ جاتا۔ جب کوئی بھی سیاسی طاقت ہو یا سماجی طاقت بڑی ہو جائے تو انسان چھوٹا ہو جاتا ہے اور یہی میں سوچتی ہوں کہ یہی سب بنیاد ہے مشکلات کی کہ انسان چھوٹا ہے چیزیں بڑی ہیں۔

مجیب صدیقی: صحیح۔

امریتا پریتم: جب وہ چیزوں سے بڑا ہو جائے گا تو انسان کی اسی میں ان مشکلات کا حل ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی مشکل سے لے کر جنگ کی بڑی سے بڑی مشکل تک۔

مجیب صدیقی: امریتا پریتم جی جب آپ نے لکھنا شروع کیا اور جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ پہلی نظم لکھنے پر مجھے ایک چپت ملی تھی۔

امریتا پریتم: وہ تو جھوٹ پر ملی تھی۔ نظم پر نہیں ملی تھی۔

مجیب صدیقی: جھوٹ بولنے پر ملی تھی۔ میں اسی دور کا حوالہ دیتے ہوئے یہ سوال کروں گا کہ اس دور میں جب آپ نے لکھنا شروع کیا تھا اور آج کے دور میں سماجی اعتبار سے اور معاشرتی اعتبار سے بہت بڑا فرق ہو گیا۔ اس تبدیلی کے دوران آپ کے فن میں بھی کوئی تبدیلی آتی رہی۔

امریتا پریتم: فن میں تبدیلی ضرور آئی۔ جب نظریہ بڑا ہوا، وشال ہوا تو ایک سچائی کو الگ الگ پہلو سے دیکھنے کی ہمت ہوئی۔ ہم ایک ہی پہلو سے دیکھتے رہے تو ہم اسے پوری سچائی From different aspects سے نہیں کہہ پاتے۔

مجیب صدیقی: اچھا آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا۔ مثلاً کوئی کہانی لکھی آپ نے۔

امریتا پریتم: جی۔

مجیب صدیقی: اس میں کوئی ایسا کردار ہے کہ جس کے بارے میں آپ نے کبھی یہ سوچا ہوتا ہے کہ اگر اس کردار کو ہم اپنی پوری مرضی سے لکھ دیں اور مان لیجیے کہ یہ کردار اچھا نہیں ہے۔ ہمارے آدرشوں کی کسوٹی پر کھرا نہیں اتر رہا ہے تو کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں اور کبھی کبھی یہ خوف ہوتا ہے لکھنے والوں کو۔

امریتا پریتم: مجیب صاحب میں نے لوگوں کو سامنے رکھ کر کچھ نہیں لکھا، ہمیشہ خود کا جو تصور ہے اس کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور اچھا یا برا کردار کچھ نہیں ہوتا بلکہ یہ لکھنے کا انداز ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو ٹھیک سے لکھ پاتے ہیں تو کچھ بھی برا نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: صحیح۔ منو بھنڈاری جی سے ایک بار ہماری بات ہوئی تھی تو وہ کہہ رہی رہی تھیں کہ ہم نے ایک ایسی عورت کا کردار لکھا جو شادی شدہ بھی تھی اور ایک جگہ معاشقہ بھی کر رہی تھی۔ کہنے لگیں کہ وہ کہانی لکھنے کے بعد اس زمانے میں میری بڑی لے دے ہوئی کہ انھوں نے اپنی ہی کہانی لکھ ڈالی ہے۔ اس قسم کی کوئی بات؟

امریتا پریتم: میرا ابھی ایسا تجربہ نہیں ہوا اور نہ میں نے اس کو کبھی سوچا ہے۔ ابھی دیکھیے ان دنوں ناروے کی کلاکار Ullman کی Autobiography آئی ہے۔ ان کی زندگی میں بہت سے واقعات آئے، شادیاں ہوئیں۔ ٹوٹیں اور شادیاں ہوئیں۔ زندگی میں اور Interest آئے لیکن پڑھتے وقت کہیں نہیں لگتا کہ اور بھی ایسے دس واقعات لکھ دیں تو ان کی طرف خیال نہیں جاتا۔ یہ لکھنے کا انداز ہے۔ یہ ان کے دل کی گہرائی ہے۔ چیزوں کو دیکھنے کا ایک نقطۂ نظر ہے۔ ان سب چیزوں کے سامنے زندگی کے حادثے بھی چھوٹے ہو جاتے ہیں جب انسان کا نظریہ بڑا ہو۔

مجیب صدیقی: صحیح دیکھیے! آپ نے Autobiography کی بات کی تو ظاہر ہے کہ وہ ذکر بھی ناگزیر ہے یعنی آپ کی کتاب 'رسیدی ٹکٹ' کا۔ اس میں بھی آپ نے جس طرح سے لکھا ہے بلاشبہ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ایسا کچھ لکھنے کے لیے بہت بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت Moral Courage کی ضرورت ہوتی ہے۔

امریتا پریتم: جی۔

مجیب صدیقی: اس کو لکھتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا کہ پڑھنے کے بعد لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔

امریتا پریتم: نہیں مجیب صاحب یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ لوگ کیا سوچیں گے۔ اسے جو Identify کر سکیں گے جو اسے پہچان پائیں گے ان کا شکریہ جو نہیں پہچان پائیں گے۔ ان سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: آپ کو کس قسم کی تسلی حاصل ہوئی یہ سب کچھ لکھ کر۔

امریتا پریتم: خود کو سامنا کرنے کی جیسے آئینے میں۔

مجیب صدیقی: اور دنیا کا سب سے مشکل کا آئینہ کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح کی تسلی آپ کو حاصل ہوئی۔

امریتا پریتم: جی ہاں ظاہر ہے نظموں میں بھی تھی صرف یہ ہے کہ اس میں نام نہیں تھے۔ تو اسی لیے میں نے اس کا نام 'رسیدی ٹکٹ' لکھا کہ جیسے ہم حساب کتاب لکھنے کے بعد ہمیشہ اس پر ایک رسیدی ٹکٹ لگاتے ہیں تاکہ وہ ایک پکی رسید بن جائے۔

مجیب صدیقی: اور وقت ضرورت پر کام آئے۔

امریتا پریتم: کام آئے یا وقت کے کام آئے گی۔

مجیب صدیقی: 'رسیدی ٹکٹ' نام رکھنے کی کوئی اور بھی وجہ تھی۔

امریتا پریتم: ایک چھوٹی سی وجہ تھی۔ ایک بار خشونت سے باتیں کر

رہی تھی۔

مجیب صدیقی: خشونت سنگھ جی سے۔

امریتا پریتم: خشونت سنگھ جی سے۔ وہ پرانے دوست ہیں تو کہنے لگے کہ تمہاری زندگی میں ایک آدھ تو واقعہ ہے۔ کوئی خاص بات تو ہوئی نہیں اگر زندگی لکھنی ہو تو ایک ٹکٹ کے پیچھے پر لکھی جائے۔ تو چھوٹے سے جو بھی حالات تھے ان کو لکھتے وقت مجھے لگا کہ سدھارن ٹکٹ کی جگہ اس کو رسیدی ٹکٹ کردوں یعنی رسید کو پکی رسید کرنے کے لیے۔

مجیب صدیقی: صحیح۔ شروع میں آپ نے اس میں یہ بھی نہیں لکھا جیسا اکثر ناول اور افسانوں کے شروع میں لکھا رہتا ہے کہ اس کے کردار اور نام فرضی ہیں۔

امریتا پریتم: وہ ناولوں پر لکھا رہتا ہے۔

مجیب صدیقی: وہ حقیقتوں پر نہیں۔

امریتا پریتم: ۔ان پر نہیں لکھا ہوتا ان پر جو نام آپ چھوڑنا چاہیں وہ چھوڑ سکتے ہیں لیکن نام غلط نہیں استعمال کرسکتے۔

مجیب صدیقی: صحیح۔ اس میں کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو خالصتاً آپ کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امریتا پریتم: سبھی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

مجیب صدیقی: جی براہ راست ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے کیا سوچ کر ہزاروں لاکھوں لوگوں کو اپنی اس ذاتی زندگی کے ساتھ شریک کیا۔

امریتا پریتم: جو لوگ شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان ہی کو ایک آواز دی تھی۔ شریک ہونا چاہتے ہو تو مہمانوں کی طرح آؤ بیٹھو، دیکھو اور اٹھ کر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔

مجیب صدیقی: صحیح اور پھر میں اسے دہراؤں گا کہ اس کے لیے واقعی بہت اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا امریتا جی آپ نے افسانے بھی لکھے۔ نظمیں بھی لکھیں، گیت بھی لکھے۔ سب سے زیادہ تسلی آپ کو کیا لکھ کر ہوئی۔

امریتا پریتم: مجیب صاحب یہ وقت وقت کی بات ہے کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ نظم لکھ کر تسلی ہوگی اور کسی چیز سے نہیں ہوگی۔ کبھی لگتا ہے کہ کینوس مجھے بڑا چاہیے۔ نظم میں نہیں کہا جائے گا تو اس کے لیے شورٹ اسٹوری افسانہ یا اور اس سے بڑا کینوس چاہیے تو ناول۔ گزشتہ دنوں 'عدالت' نام کی ایک کہانی لکھی تھی جس میں تین کردار دکھائی دیتے ہیں مگر اصل میں ایک ہے۔ وہی ملزم ہے وہی وکیل ہے اور وہی جج تو لکھنے کے بعد یہ لگا کہ اس میں بہت کچھ چھوٹ گیا۔ یہ کردار کہاں پہنچ سکتا تھا تو ایک Streame of Consensus کا تجربہ کیا۔ اس کو پھر ناول کے Form میں لکھا۔ ایک ہی کمرے میں بیٹھا ہے کہیں اٹھ کے جاتا نہیں اور سپنا آتا ہے اور گھبرا کر جاگتا ہے اور وہ ناول شروع ہوتا ہے اور اب دوسری رات دوسرا سپنا آنے پر ناول ختم ہو جاتا ہے۔ کمرے سے کہیں باہر نہیں جاتا کردار۔ ایک بار ٹیلی فون آتا ہے، ایک بار اخبار آتا ہے، ایک بار ایک چھوٹا سا کتا آتا ہے، ایک بار اس کے نام کی لگی پلیٹ کی کیل گر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا وہ پورا ناول ہے۔ اس پر تو کبھی وہ ہزاروں برس پیچھے چلا جاتا ہے کبھی اسی کمرے میں لوٹ آتا ہے۔ باہر سے کچھ نہیں ہوتا تو یہ ایسا لگا تھا کہ پہلے افسانہ لکھا بعد میں ناول لکھا۔

مجیب صدیقی: اچھا! آپ نے یہ محسوس کیا کہ ادب میں بھی بہت سے رجحانات میں تبدیلی آئی ہے۔

امریتا پریتم: جی۔

مجیب صدیقی: مثلاً اردو ادب میں جدید ادب آیا ترقی پسند ادب ہوا اس قسم کی کوئی تبدیلیاں آپ کے لکھن میں آئی ہیں۔

امریتا پریتم: ضرور آئی ہیں کیونکہ وقت کے ساتھ جب تجربہ بڑھتا ہے تو Maturity آتی ہے اور جب ہم دنیا کی چیزیں پڑھتے ہیں اور دنیا میں، میں جہاں جہاں گئی ہوں وہاں کے ادب کی دس دس نظمیں اپنی زبان میں ترجمہ کیں تو دیکھا کہ کہاں تک Expression پہنچے ہیں۔ کہاں یہ Subjects بدلتے ہیں۔ کیا انداز بدلے ہیں۔ وہ ایک Study بھی ہے۔

مجیب صدیقی: وہ تو ہوئی ایک Study۔ آپ کے اپنے ذہن نے اپنے بدلے ہوئے (سوال ادھورا رہ جاتا ہے)

امریتا پریتم: تو Study سے خود یہ فرق پڑے گا۔ ظاہر ہے ہماری Study سے ہماری Maturity سے ہمارے انداز بھی بدلیں گے۔ تو کوشش یہی کی ہے۔

مجیب صدیقی: امریتا جی آپ کے تخلیقات کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے، سوسائٹی سے اور ہماری جو Day-to-day social life ہے۔ حالانکہ بے حد خوبصورت ہیں آپ کی تخلیقات لیکن۔ ان سے کچھ سمبندھ کم ہے؟

امریتا پریتم: نہیں مجیب صاحب ایسا ہے۔ بہت سے لوگوں کا ہو سکتا

ہے کہ ان سے سمبندھ کم ہو۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کا ان ہی سے سمبندھ ہے۔ ان ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ Depend کرتا ہے جیسے Democracy کو میں تو یہ نہیں کہوں گی کہ نہیں مانتی ہوں۔ چاہے تھوڑے سے لوگوں کی رائے ہو جو زیادہ وزنی ہے بہ نسبت بہت سے لوگوں کی ہو۔ بہت سے لوگ ایک بھیڑ کا نام ہے۔ ایک Crowd کا نام ہے۔ تھوڑے سے Individual جو ہیں کیا ان کی زندگی کی حقیقت، حقیقت نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: یقیناً ہے۔ لیکن ایک عام معاشرے کی جو عام سماجی زندگی ہے میں اس کی بات کر رہا تھا۔

امریتا پریتم: تو اسے عام سے ہٹ کر کہہ لیجیے۔ تھوڑے سے لوگوں کی Reality کہہ لیجیے۔

مجیب صدیقی: صحیح ہے۔

امریتا پریتم: کیونکہ مجھے ان میں individuals دلچسپی ہے جو اپنی لڑائی لڑتے ہیں اور جو عام معیار Accepted ہیں ان سے الگ ہٹ کر چلتے ہیں۔ مجھے بھیڑ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: ذہنی طور پر آپ تنہائی پسند ہیں۔ شاید آپ اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔

امریتا پریتم: جو اپنے wave length کے لوگ ہوں۔

مجیب صدیقی: صحیح صرف ان کے ساتھ۔

امریتا پریتم: جی۔

مجیب صدیقی: اجنبیوں سے گھلنے ملنے میں آپ کو تکلف ہے۔

امریتا پریتم: نہیں ان میں اجنبی بھی ہو سکتے ہیں۔

مجیب صدیقی Wavelenght کی بات ہے۔

امریتا پریتم: جن کی Wavelength ہے وہ اجنبی کیسے رہے۔

مجیب صدیقی: اب امریتا جی کچھ باتیں فلموں کے بارے میں۔ ہمارے کئی بڑے بڑے ادیبوں نے یہ کوشش کی کہ وہ فلموں میں لکھیں اور فلموں کے بارے میں ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ فلم کی کہانی کا کمزور ہونا ہی ہماری فلموں کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ خواجہ احمد عباس صاحب نے بھی لکھا، کرشن چندر نے بھی لکھا آپ کو معلوم ہے۔ منو بھنڈاری جی نے بھی لکھا۔ آپ نے بھی فلم کے لیے لکھا؟

امریتا پریتم: میں نے فلم کے لیے نہیں لکھا بلکہ کسی ڈائرکٹر نے میرے ناول کو فلم کے لیے Select کر لیا۔ اس پر انھوں نے فلم بنانا چاہا اور بنائی جیسے 'کادمبری' اس ناول کا نام ہے 'دھرتی ساگر اور سیپیاں' اور ایک فلم 'ڈاکو' بنی ناول کا نام ہے 'ان کی کہانی'۔ فلم کے لیے میں نے نہیں لکھا۔

مجیب صدیقی: فلم کے لیے آپ نے نہیں لکھا بلکہ انھوں نے ناول آپ سے لیا۔ آپ نے کیا سمجھا کہ فلم جب بنی تو اس نے ناول کے ان تمام تقاضوں کو پورا کیا۔

امریتا پریتم: نہیں دونوں میں نہیں ہوا۔

مجیب صدیقی : دونوں میں نہیں ہوا۔ یعنی فلم کی کامیابی یا ناکامیابی بھی۔

امریتا پریتم : میں سوچتی ہوں کہ فلم اتنا بڑا میڈیا ہے جس میں سبھی فنون آ جاتے ہیں تو اس میں تو بات بہت آگے بڑھنی چاہیے تھی۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے ہم اپنے تصور میں دیکھتے ہیں یہ کردار کیسا ہوگا۔ لیکن فلم اسکرین پر تو ہمیں دکھائی دیتا ہے تو ناول سے آگے جانا چاہیے اس میڈیا کو، پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

مجیب صدیقی : کیا آپ نے ان کو پیشکش نہیں کی کہ اس کا اسکرین پلے آپ خود ہی لکھیں اور ڈائیلاگ بھی۔

امریتا پریتم : ڈائیلاگ تو میرے ہیں مگر اسکرین پلے انھوں نے لکھے ہیں۔ وہ بات انھیں پائی جو آنی چاہیے۔

مجیب صدیقی : جو بات آپ کہہ رہی ہیں وہ اسکرین پلے لکھ کر کی جا سکتی تھی۔

امریتا پریتم: جی ہاں کی جا سکتی تھی۔

مجیب صدیقی: تو میرا خیال ہے کہ آپ کو اسکرین پلے پہلے سے دیکھنا چاہیے تھا۔

امریتا پریتم: مجھے لگا کہ جنھوں نے ناول سلیکٹ کیا ہے انھوں نے اس کو ضرور پایا ہوگا اور اس کی گہرائی کو سمجھ لیا ہوگا۔ تبھی تو انھوں نے یہ Select کیا۔ لیکن بننے کے بعد لگا کہ بات بن نہیں پائی۔

مجیب صدیقی : دیکھیے 'مثلاً' 'کادمبری' جب آئی تو اس فلم کے دیکھنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ امریتا پریتم کی کہانی ہے چل کر دیکھا جائے۔ اور میرے جیسے لاکھوں کروڑوں لوگ محض اسی لیے گئے ہوں گے۔ اب وہ شاعری اور بنیادی طور پر آپ نے جس پیاس کی بات کی تھی۔

امریتا پریتم: کہانی میں ہے نہ لیکن اسکرین پر وہ نہیں اتر پائی۔ یہ میڈیا ایک دم الگ ہے۔ فلم دراصل ڈائریکٹر کی فلم ہوتی ہے۔ لکھنے والے کی نہیں ہوتی Zobra the Greek ناول آپ نے بھی پڑھا ہوگا

اور اس کی فلم بھی دیکھی ہوگی۔ اب ڈائرکٹر کو معلوم ہے کہ ناول کو کہاں چھوڑ دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے اس نے آدھے سے تھوڑا آگے جا کر ناول کو چھوڑ دیا۔ فلم وہیں ختم کر دی لیکن وہ بہت ٹھیک اختتام ہے اس کا۔

مجیب صدیقی: جی۔

امریتا پریتم: جتنا بڑا ڈائرکٹر ہوگا اتنی کامیاب فلم ہوگی۔

مجیب صدیقی: کیا آپ کچھ اور فلموں کے لیے لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

امریتا پریتم: نہیں بالکل نہیں۔

مجیب صدیقی: آپ کے کسی اور ناول پر فلم بنانے کے لیے فلم والے سوچ رہے ہیں۔

امریتا پریتم: باسو بھٹا چاریہ کبھی کبھی سوچتے ہیں ایک ناول کو جس کے لیے ہمارے ریوتی سرن شرما کہتے ہیں کہ اس کو بالکل نہیں بنانا چاہیے کیونکہ یہ اپنے وقت سے سو سال پہلے لکھا گیا ہے۔ باسو بھی یہی سوچتے ہیں اور ایسا ہی کہتے ہیں کہ یہ مجھے بہت خطرناک ناول لگتا ہے۔ خطرناک ان معنوں میں کہ اگر اسے ہم پوری طرح اسکرین پر نہیں اتار سکے تو مر جائیں گے۔

مجیب صدیقی: صحیح ہے۔

امریتا پریتم: It's so daring end

مجیب صدیقی: لیکن آپ نے فلموں کے لیے گیت بھی تو لکھے ہیں۔

امریتا پریتم: ایک دو گیت 'ڈاکو' کے لیے اور ایک 'کادمبری' کے لیے لکھے تھے۔

مجیب صدیقی: اب گیت لکھنے کا کوئی ارادہ ہے۔

امریتا پریتم: جب تک کہانی من سے میرے نہ جڑے تب تک گیت نہیں لکھ پاتی۔ صرف فلموں کے لیے گیت لکھنے میں مجھے دلچسپی نہیں ہے۔

مجیب صدیقی: اچھا کہانی کا Scene inspiration چاہیے گیت لکھنے کے لیے۔

امریتا پریتم: کہانی میں وہ جگہ چاہیے جہاں الگ سے ہٹ کر کہنے کا کچھ موقع ہو۔

مجیب صدیقی: امریتا پریتم جی آج تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ نے اپنا شاہکار لکھ لیا؟

امریتا پریتم: یہ تو مجیب صاحب کبھی بھی نہیں لگتا۔

مجیب صدیقی: ہر فنکار یہی کہتا ہے۔

امریتا پریتم: اگر ایسا لگنے لگے تو میرا خیال ہے کہ بعد میں ہم کچھ نہیں لکھ سکتے۔

مجیب صدیقی: آپ نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس میں ذاتی طور پر آپ کو کون سا پسند ہے۔

امریتا پریتم: سب سے پہلے پسند آیا تھا ناول 'یاتری' اور اب جو نیا ناول لکھا ہے وہ ہے 'تیرھواں سورج'۔ بارہ سورج تو ہمارے پران میں لکھے ہوئے ہیں۔ تو تیرھواں سورج میں نے لیا ہے انسان کے Intellect کو جیسے اتہاس میں آتا ہے کہ دھرت راشٹر کا رتھ چلا رہے تھے سنجے۔ وہ تو آنکھوں سے دیکھ نہیں پاتے تھے جب کہ کورو اور پانڈو لڑنے لگے تو انھوں نے جنگ کے حالات کو جاننا چاہا تو سنجے نے ان کو یہ سب سنایا۔ سنجے کو یہ صلاحیت خداداد ملی تھی کہ وہ دور بیٹھ کر بھی جنگ کا حال دیکھ سکیں اور سنا سکیں۔ اسی لیے میں نے اس کا نام سنجے رکھا کہ وہ خود کو Identify کرتا ہے اس سے۔ لیکن ادیب ہونے کے ناطے وہ ایک باس کے رتھ کو آج کی زندگی کے حالات سناتا ہے کہ لوگ کیسے سفر کرتے ہیں۔ کیسے درد سے گزرتے ہیں۔ تو اس کو میں نے تیرھواں سورج کہا ہے۔ اس کے بعد یہ کردار مجھ کو تنگ کرتے رہے اور لکھنے کے بعد ایسا لگا کہ نہ وہ مجھ سے چھوٹ پائے اور نہ میں اس سے چھوٹ پائی ہوں۔ ایک اور ناول لکھ رہی ہوں Forty Nine Days وہی کردار ہیں جیسے تبتی فلسفہ ہے کہ مرنے کے بعد There are forty nine days between death and rebirth تو ان کو علامتی طور پر استعمال کیا ہے۔

مجیب صدیقی: امریتا پریتم جی۔ ایک آخری سوال کہ مثلاً آج سے سو برس بعد جب اپنے ملک کے ادیبوں کی دانشوروں کی تاریخ لکھی جائے تو آپ کیا سمجھتی ہیں کہ آپ کا تذکرہ اس میں کس طرح سے کیا جانا چاہیے۔

امریتا پریتم: مجیب صاحب یہاں اپنا نہیں ساحر کا شعر دہرا دیتی ہوں۔

میں پل دو پل کا شاعر ہوں

مجیب صدیقی: یہ تو وقت فیصلہ کرے گا۔ اچھا امریتا پریتم جی آپ کا بہت بہت شکریہ

امریتا پریتم: اور امید ہے کہ ہمارے سننے والوں نے آپ کی یہ دلچسپ گفتگو سن کر بہت کچھ حاصل کیا ہوگا۔ بے حد شکریہ۔ ■

مادرِ ہمدرد رابعہ بیگم

داستان ایک عالی ہمت خاتون کی

انور ادیب

کہتے ہیں کہ عزم کامل ہو تو کشتی لبِ ساحل ہوگی۔

ایک عالی ہمت خاتون نے اپنے عزم و حوصلہ، اپنی لگن و محنت سے نامساعد حالات میں جس عزم و حوصلہ کا مظاہرہ کیا وہ نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایک خاتون بھی ہوا کا رخ بدل سکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر دور میں ایسی قابل قدر مائیں پیدا ہوتی رہی ہیں جن کے سایۂ عاطفت اور آغوشِ تربیت میں نابغۂ روزگار شخصیتیں پرورش پاتی رہی ہیں۔ یہ ایک ایسی ہی ماں کی داستان بصیرت انگیز ہے جن کا نام رابعہ بیگم ہے جو عالم شہرت کے طبی ادارے ''ہمدرد'' کے روحِ رواں حکیم عبدالحمید کی والدۂ محترمہ تھیں۔ ان کے شوہر حکیم حافظ عبدالمجید ہمدرد دواخانہ کے بانی تھے۔ اس کے قیام سے قبل وہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے مشہور دواخانہ جو ''ہندوستانی دواخانہ'' کے نام سے خاصی شہرت کا مالک تھا، میں ملازم تھے۔ اس وقت ان کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار تھی۔ یہ 1900 کی بات ہے۔ دوران ملازمت انہوں نے علم طب کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ یونانی مفردات و مرکبات کے بارے میں ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ وہ زبردست تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ ان کے بلند عزم و حوصلہ اور دور اندیشی کا غماز تھا۔ انہوں نے ہندوستانی دواخانہ کی ملازمت ترک کردی اور ہندوستانی دواخانہ کے قریب دوا فروشی کی ایک چھوٹی سی دوکان شروع کی۔ حکیم صاحب کی چھوٹی سی دوکان کو دیکھ کر لوگ سوچتے تھے کہ حکیم اجمل خان کی عظیم الشان ''ہندوستانی دواخانہ'' کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی دوا کی دوکان کا چلنا مشکل ہے۔ لیکن جب یہ چھوٹی سی دکان دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ حکیم صاحب کے اخلاص اور لگن کا نتیجہ تھا۔ حکیم صاحب ایک بلند اخلاق و کردار کے مالک تھے۔ اور خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ان کی اہلیہ رابعہ بیگم بھی بے حد نیک سیرت اور خدمتِ خلق کے جذبے میں کسی طرح اپنے شوہر سے کم نہیں تھیں۔ ان کی للّٰہیت اور نیک نیتی ضرب المثل تھی۔ حکیم صاحب کی کوششوں میں ان کی نیک سیرت بیگم کا زبردست ہاتھ تھا۔ وہ ایک اطاعت شعار اور خدمت گزار خاتون تھیں ساتھ ہی بے انتہا انتظامی صلاحیت کی مالک تھیں۔ انہوں نے جس سلیقہ اور کفایت شعاری سے امورِ خانہ داری کو انجام دیا اس سے حکیم صاحب کو یکسوئی کے ساتھ کاروبار کی طرف بھرپور توجہ دینے کا موقع ملا۔ وہ بے حد کفایت شعار تھیں۔ انہوں نے اپنی کفایت شعاری سے حکیم صاحب کی ایک مشکل آسان کردی۔ توسیع کاروبار کے لئے جب انہیں ایک خطیر رقم کی ضرورت ہوئی تو رابعہ بیگم نے پس انداز کی ہوئی رقم انہیں پیش کردی اس سے ایک بڑی عملدت کی خریداری ممکن ہوئی

رابعہ بیگم ایک حوصلہ مند خاتون تھیں۔ ان کے حوصلہ اور صبر کا امتحان اس وقت شروع ہوا جب ان کے شوہر حکیم عبدالمجید صاحب کا 23/ جون 1922 میں 40 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس وقت ان کے بڑے بیٹے عبدالمجید کی عمر 13 سال تھی اور چھوٹے بیٹے محمد سعید 2 سال کے تھے۔

حکیم عبدالمجید صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے نہایت ہمت اور حوصلہ سے حکیم صاحب کے کاروبار کو سنبھالا اور اپنے حسنِ انتظام اور کمالِ تدبر سے دواخانہ کو بامِ عروج تک پہنچا دیا اور یہ سارا کام انہوں نے گھر بیٹھے کیا اور کسی طرح بھی اپنے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس سے ان کی انتظامی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

رابعہ بیگم نے اپنی بے نظیر تعلیم و تربیت سے اپنے بچوں کو مثالی کردار کا حامل بنا دیا۔ انہیں اپنے شوہر کے عزائم کا علم تھا۔ وہ ان سے کہا

کرتے تھے کہ ”مجھے ہمدرد کا مستقبل تابناک نظر آرہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عبدالحمید بڑا ہو کر ہمدرد کو ایسی عظمتوں کا حامل بنائے گا جس سے وہ ساری دنیا کے لئے نمونہ ہوگا۔“ رابعہ بیگم نے اپنے بچوں کی تربیت میں اپنے شوہر کی اس سوچ کو ہمیشہ سامنے رکھا۔ اسی لئے بچے بڑے ہو کر اپنی والدہ محترمہ کے اس انداز تربیت کو یاد کرتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے رابعہ بیگم کے اخلاص اور لگن کے پیش نظر انہیں مادر ہمدرد کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمدرد دواخانہ کی ترقی رابعہ بیگم کی مرہون منت ہے۔ یہ ان کی بصیرت افروز تربیت کا اثر تھا کہ حکیم عبدالحمید نے اپنی انتھک محنت اور لگن سے ہمدرد دواخانہ کو مثالی ترقی پر پہنچا دیا۔ وہ اس کا اکثر اعتراف کرتے تھے کہ یہ ان کی والدہ کی روحانی تربیت سے ممکن ہوا۔ حکیم عبدالحمید صاحب کے اندر خدمتِ خلق کا زبردست جذبہ کے پروان چڑھانے میں ان کی والدہ محترمہ کی تربیت شامل تھی۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے یکم جنوری 1948 کو ہمدرد دواخانہ کو ملک و ملت کی فلاح کے لئے وقف کر دیا۔ منافع کے بہت بڑے حصہ کو ہندوستانی اطبا کی ریسرچ اور ترقی اور قوم کی تعلیمی ضروریات کے لئے مخصوص کر دیا۔ لہٰذا یہ ادارہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم ہے اور اپنی شاندار خدمات کی بنا پر آج ایشیا کا سب سے بڑا طبی ادارہ ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب نے اس ادارہ کی آمدنی سے زبردست طبی اور فلاحی خدمات انجام دیئے جو ہندوستانی طب کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اور ان کے ذکر کے بغیر ہندوستانی طب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

محترمہ رابعہ بیگم 1948 میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد 26 برسوں تک انہوں نے اپنے لائق فرزند حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کی شاندار کامیابیوں کو دیکھا جو یقیناً ان کے ایثار اور قربانیوں کا ثمرہ ہیں۔

Dr. Anwar Adeeb
Ibrahim Manzil,
Mosaddi Mohalla, Railpar
Asansol-713302 (West Bengal)

فرہنگ آصفیہ سے

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں یا نکالنی رہ گئی ہیں - محاورہ۔ بہت سا کام تو ہو چکا ہے۔ تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ بہت سی مصیبت کاٹ لی تھوڑی سی باقی رہی ہے۔ ہاتھی نکل گیا ہے۔ دم رہ گئی ہے (فقرہ) ساری سوئیاں نکال لیں۔ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں۔ (عو) یعنی کام کیا اور پھر نہ کیا۔ عورتیں اس کا قصہ یوں مشہور کرتی ہیں کہ کسی سوداگر بچہ کی کسی جادوگرنی سے دوستی تھی سو وہ اسکی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی ایک روز کیا ہوا کہ اس نے اسکی بیوی کے مارنے کو سوداگر بچہ کے گھر میں جادو کی پڑیا پھنکوا دی۔ قضا عند اللہ وہ پڑیا اس نیک بخت بیوی کے اوپر تو نہ پڑی سوداگر بچہ ہی کے بدن پر جا پڑی اس کا پڑنا تھا کہ تمام تن بدن میں سوئیاں ہی سوئیاں پھک گئیں۔ سوداگر بچہ اس تکلیف کے مارے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کی بیوی جو صبح کی نماز پڑھ کر اٹھی تو یہ حال دیکھ کر بہت سٹپٹائی اور اسی دم سے سوئیاں نکالنے بیٹھ گئی ہاتھوں سے سوئیاں نکالنے میں اسکے خاوند کو تکلیف ہونے لگی تو اسنے اپنے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں۔ تیسرے پہر ساری سوئیاں نکال ڈالیں۔ صرف آنکھوں کی سوئیاں رہی تھیں کہ ظہر کا وقت تنگ ہونے لگا۔ یہ اپنی باندی کو خاوند کے پاس بٹھا کر آپ نماز پڑھنے چلی گئی۔ (باندی نے اس موقع کو غنیمت جان کر رہی سہی سوئیاں جھٹ پٹ نکال ڈالیں۔ ان کا نکلنا تھا کہ ایک کانٹا سا نکل گیا۔ سوداگر بچہ کی جان میں جان آگئی۔ الاللہ کر کے اٹھ بیٹھا آنکھ کھولتے ہی باندی کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھا اور اس کا احسان سمجھ کر بن داموں غلام بن گیا۔ بیوی کی صورت سے بیزار ہو گیا۔ اس بے چاری کو تو آنکھوں سے گرا دیا۔ اور اسکی لونڈی کو بیوی بنا لیا۔ وہی مثل ہوئی کہ باندی تھی سو بیوی ہوئی اور بیوی تھی سو باندی ہوئی۔ اس زمانہ سے یہ محاورہ ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

عوام لوگوں میں مشہور ہے کہ جب کوئی جادوگر اپنے کسی دشمن کو سزا دینی چاہتا ہے تو اسکے نام پر ماش کے آٹے کا پتلا بنا کر اس کے تمام بدن میں سوئیں یا سوئیاں بھونک دیتا ہے۔ اور اس پتلے کو مرگھٹ میں جا کر ڈال آتا ہے۔ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ جو کچھ اس پتلے کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا پورا پورا اثر دشمن کے جسم پر پہنچتا ہے۔

شاعرات کے منتخب اشعار

ابھی تو پچھلی عنایت کا زخم تازہ ہے
سنا ہے اک نئی سازش کا پھر ارادہ ہے

یہ کہہ کے لوگوں نے قبلے بدل لیے اپنے
یہی تو مصلحت وقت کا تقاضہ ہے

عذرا نقوی

وفا کا شہر اندھیروں میں ڈوب جائے گا
جنونِ عشق میں کرتا ہوں روشنی کی دعا

یہ انقلاب تمدن نہیں تو پھر کیا ہے؟
خیال و خواب کی باتیں ہیں دوستی کی دعا!

زملانگہ

ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے شہر یار ابھی
خموش بیٹھے ہیں دھاگا لپیٹنے والے

زمین عشق کی شادابیاں ہمیں سے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ! جڑیں اپنی کھودنے والے

کہکشاں تبسم

حشر برپا کریں وہ پل بھر میں
رو کے مانگیں اگر دعا آنکھیں

جس کے دیدے کا مر گیا پانی!
اس کی آنکھوں سے مت ملا آنکھیں!!

اندو تنہا

بات یہاں بے بات بنائی جاتی ہے
کب کوئی الجھن سلجھائی جاتی ہے

ظلمت بانٹنے والوں کا دیکھو یہ فریب
صبح ہمیں پیہم دکھلائی جاتی ہے

فریدہ لکھانی فرح

تمہاری یاد کو جب دل سے جھاڑ کر اٹھے
ہم اپنا آپا وہیں پہ اجاڑ کر اٹھے

بدل ہی لیں گے ستارے بھی راستہ اپنا
اگر یہ صبح اندھیرے کو پھاڑ کر اٹھے

عشرت ظہیر

بیٹیاں بیٹھی رہیں ماں باپ کی دہلیز پر
کوئی پرساں حال بندہ، عقد کو حاضر نہ تھا

پی گیا تھا کتنے درد و کرب کا دریا، مگر
پھر بھی اس کا درد اس کی آنکھ سے ظاہر نہ تھا

ممتاراتی

سطح دل پر ہے کسی یاد کا پر تو ایسے
جیسے شیشے پہ چمکتی ہوئی بارش کی بوند

مشعل بدست کوئی مرے ساتھ چل پڑا
تاریک وادیوں سے مرا جب گزر ہوا

حسنٰی سرور

ڈاکٹر صبیحہ ناہید

فیمینزم اور نذیر احمد کے ناولوں کی عورت

فیمینزم خواتین کے اندر کا وہ تحرک ہے، جس نے تحریک کی شکل بھلے ہی حالیہ صدی یا اس سے کچھ قبل اختیار کی ہو لیکن عورتوں میں اس تحریک اور اس سے متعلق نظریوں کی آمد سے بھی بہت قبل یہ احساس موجود رہا کہ عورت مظلوم ہے۔ اس پر ہمیشہ سے مرد اساس معاشرے اور نظام نے جبر و استبداد روا رکھا ہے۔ جو صرف صنفی تفریق کے سبب ہوتا رہا ہے۔

فیمینزم کا مقصد یہ ہے کہ صدیوں سے دبائی گئی عورت کے اندر یہ احساس و شعور پیدا کیا جائے کہ وہ ''شئے'' نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل اکائی کی شکل میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ عالمی معاشرے میں اسے سیاسی' سماجی' اقتصادی اور دوسری سطحوں پر مساویانہ حقوق اور برابری کے مراتب حاصل ہوں۔ وہ مجہول' ناقص العقل اور کمزور و کمتر نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خواتین یا سماج کے کسی خاص طبقے کو نظر انداز کر کے کسی صحت مند یا ترقی یافتہ معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ کمہار کے دو ہاتھ ہیں' جنہیں کوئی جنت نظیر بستی تعمیر کرنی ہے۔

عورت کے ساتھ کی گئی نابرابری کے بارے میں پاکستانی مصنفہ خالدہ حسین جناب ممتاز مفتی کے خیالات پر اختلاف رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''ان کے نزدیک عورت اب بھی زمانے سے کٹی ہوئی کہیں خلاء میں لٹکی ہوئی بے ذہن جنس تھی اور یہ ان کے خیال میں اب تک ہے۔ ممتاز مفتی بہت بڑے ادیب تھے۔ بہت بڑے لکھاری۔ میرا منہ کیا کہ ان سے اختلاف کی جرأت کروں۔ مگر وہ زندگی بھر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ عورت کا دماغ نہیں ہونا چاہیے۔ عورت تو جذبوں کی پھہار اور ساز کا تار ہے اور ایسا ہی سب کچھ ہے۔ جیسے ہی اس نے ذہن سے کام لیا وہ ''نا عورت'' ہو گئی۔'' (کسوٹی جدید' نسائی ادب نمبر' ص۔ 47)

یہ اظہر من الشمس ہے کہ ذکر جب تانیثیت کا ہوتا ہے تو اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عورتوں کو ادب میں روشناس کرانے کا سہرا مردوں کے ہی سر جاتا ہے۔ اوّل ڈپٹی نذیر احمد اور دوئم علامہ راشد الخیری' جن کو صحیح معنوں میں نسائی ادب کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا تعلق پڑھے لکھے متوسط طبقے سے تھا۔ علامہ راشد الخیری کی نسائی ادب کے حوالے سے جتنی تخلیقات منظر عام پر آئیں اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی عورت

ڈپٹی نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے متوسط طبقے کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جو ان کے طبقاتی شعور کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی اصلاحی کوششوں کا نصب العین بڑی حد تک متوسط طبقے کی عورتوں کی اصلاح تھا۔ سرسید کی تمام تر توجہ کا مرکز مردوں کی اصلاح رہی ہے۔ عورتوں کے مسائل پر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کے برعکس نذیر احمد نے عورتوں کے حال و زار پر توجہ دی کیونکہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ایک صحت مند سوسائٹی کی تعمیر میں عورتوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے ہوتا ہے:

''رہ گیا طرز تمدن' اس میں عورتوں کا بڑا دخل ہے اور کیوں نہ ہو آخر وہ بھی تو سوسائٹی میں داخل ہیں۔''

(اردو ناول میں عورت کا تصور' فہمیدہ کبیر' ص۔ 13)

جہاں تک طبقہ اعلیٰ کی عورتوں کا تعلق ہے ان کی زندگی کے عکاسی نذیر احمد کی ناولوں میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس طبقے کے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی اصلاح کی گنجائش انہیں نظر نہیں آتی۔ نذیر احمد نے متوسط طبقے کی عورتوں کی اصل حالت کی عکاسی کر کے ان کی پستی کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں جاگیردارانہ نظام کی ماری ہوئی عورت کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے' جس کو مرد اپنی ملکیت سمجھتے

تھے۔ نذیر احمد نے ان کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کی آپس کی رنجشوں، اخلاقی پستی، جہالت، ضعیف الاعتقادی، رسم و رواج کی پابندی، مذہب اور ارکان مذہب سے بیگانگی اور اس قسم کی دوسری برائیوں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ انہیں برائیوں کی بنا پر وہ ایک اچھی ماں اور سلیقہ مند بیوی بننے سے قاصر ہیں۔ انہیں اس طبقے کی معاشرتی بدحالی اور زبوں حالی کا شدید احساس ہے اپنے ناول ''ایامیٰ'' میں خواجہ مشتاق کی زبانی وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''اس ملک کی عورتوں اور جانوروں میں فرق کرتا ہوں مگر بہت ہی کم۔ ان میں نہ بی بی ہونے کی صلاحیت ہے نہ ماں ہونے کی۔ اور صلاحیت ہو تو کہاں سے ہو۔ تعلیم نہیں، تربیت نہیں۔ بیویاں نہ کہوں معزز لونڈیاں، مقرب مامیں۔ کیونکہ گھر کی ٹہل اور خدمت کے سوائے ان کو کچھ اور بھی آتا ہے۔'' (ایامیٰ، ص۔124)

نذیر احمد کی معرکتہ الآرہ تخلیق ''مرآۃ العروس'' کے حسب ذیل اقتباس میں انہوں نے عورتوں کی سماجی بے وقعتی پر مزید روشنی ڈالی ہے:

''عام دستور کے موافق ہم تو عورتوں کی کچھ قدر دیکھتے نہیں۔ خانہ داری کے برتاؤ میں دیکھو تو گھر کی ٹہل خدمت کے علاوہ کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے لیا جاتا ہے یا کسی عمدہ کام کے صلاح مشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں۔''

(مرآۃ العروس، ص۔25)

جیسا کہ مرآۃ العروس میں مختلف جگہوں پر تذکرہ ہے کہ عورتوں کو ملازمت تو کرنی نہیں ہے پھر تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ نذیر احمد نے اپنے ناول ''ایامیٰ'' میں بادی بیگم کے الفاظ میں تعلیم کے متعلق عام عورتوں کی تنگ نظری پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی ہیں:

''میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں دخل نہ دیا ہے نہ آگے دونگی۔ رہی لڑکی اس کو نہ نوکری کرنی ہے نہ لڑکوں میں لیاقت علمی جتانی ہے۔ جیسا برا بھلا مجھ کو آتا تھا کچ کچ سکھا پڑھا لوں گی۔ (ایامیٰ، ص۔7)

اس دور میں ایسا بھی خیال کیا جاتا تھا کہ اگر عورتیں پڑھ لکھ لیں گی تو غیر مردوں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔ یہ خیال بھی عورتوں کے علم حاصل کرنے میں مانع ہوتا تھا۔ اس کا ذکر مرآۃ العروس میں نذیر احمد نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''مصیبت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ عورتوں کے لکھانے پڑھانے کو عیب اور گناہ خیال کرتے ہیں۔ ان کو خدشہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لکھنے پڑھنے سے عورتوں کی چار آنکھیں ہو جائیں۔ غیر مردوں سے خط و کتابت کرنے اور خدا نخواستہ کل کلاں کو ان کی پاکدامنی اور پردہ داری میں کسی طرح کا فتور واقع ہو۔''

(مرآۃ العروس، ص۔17)

نذیر احمد کو بیواؤں کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مذہب نے اگر چہ انہیں عقد ثانی کی اجازت دی ہے لیکن سوسائٹی نے انہیں اس حق سے محروم کر کے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ ''فسانہ مبتلا'' میں اس امر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے:

''سب سے بڑا ظلم جو ہم نے عورتوں پر کر رکھا ہے کہ بیوہ کو دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے'' (فسانہ مبتلا، ص۔15)

ان کا خیال ہے کہ بیواؤں کو اس حق سے محروم کر کے ہم نے معاشرے کے لئے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر شریف بیوائیں ترغیبات کا شکار ہو کر بدی کا راستہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''ایامیٰ'' میں آزدی بیگم بڑی آسانی سے چھلاوہ کٹنی کی باتوں میں آ کر بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

نذیر احمد کا خیال ہے کہ عورتوں کی بہترین صلاحیتیں بغیر تعلیم کے مکمل طور پر نہیں ابھر سکتیں اور نہ ان کے اندر پاک دامنی اور نیکی کا صحیح احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس طرح وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''ہماری عورتوں میں حیا، پاکدامنی، پردہ داری، نیکی جو کچھ سمجھو خدا کے فضل و کرم سے بہتری ہے۔ مگر برا مانو یا بھلا ابھی تک ہے مجبوری کی۔ یعنی مذہب اور ملکی رواج اور مردوں کی حکومت نے عورتوں کو زبردستی نیک بنا رکھا ہے۔ لیکن اگر خود عورتوں کے دل سے نیکی کا تقاضہ ہو تو سبحان اللہ۔۔۔۔۔ مگر دل سے نیکی کے تقاضے کے پیدا ہونے کی علم کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں۔ پس جو لوگ عورتوں کو علم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں گویا ان کی سچی اور حقیقی اور پاکیزہ اور بے لوث اور کھری اور پائیدار نیک دلی سے روکتے ہیں۔''

(مرآۃ العروس، ص۔19۔20)

Sabiha Naheed
103, Tulip Apartment, Jamia Nagar
Okhla, New Delhi-110025

ثنا اسد

عہد ساز فکشن نگار
قرۃ العین حیدر

اگر چہ اُردو زبان کو رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، واجدہ تبسم، ہاجرہ مسرور اور ذکیہ مشہدی وغیرہ جیسی متعدد اہم خاتون فکشن نگاروں کی دین قابل ذکر اور قابل قدر ہے لیکن عہد ساز خاتون ناول نویس وافسانہ نگار ہونے کا شرف صرف قرۃ العین حیدر کو ہی حاصل ہے۔ مگر یہ شرف انہیں محض اس لئے حاصل نہیں ہوا کہ انہوں نے بہت سے افسانے اور ناول تحریر کیے یا وہ اس وجہ سے اُردو کی اولین فکشن نگار ہیں جنہیں ہندوستان کے انتہائی باوقار ادبی اعزاز ''گیان پیٹھ'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ دراصل قرۃ العین حیدر کو جو ادبی حلقوں میں عینی آپا کے نام سے مشہور ہیں، عہد ساز خاتون ناول نگار ہونے کا افتخار اس لئے حاصل ہے کہ انہوں نے اُردو افسانہ اور ناول نگاری میں پہلی مرتبہ شعوری رو (Stream of Consciousness) تکنیک کا استعمال کیا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی برمحل ہوگا کہ یورپی ممالک بالخصوص انگلینڈ اور فرانس کے فکشن نگاروں نے سب سے پہلے شعوری رو تکنیک کو اپنی تخلیقات میں استعمال کیا بالخصوص جیمس جوائس اور ورجینا وولف نے اس ادبی تکنیک کو اپنے ناولوں میں سلیقے سے برتا اور اس تکنیک کی بدولت انہیں اور اُن کی تخلیقات کو عالمی شہرت و مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ چونکہ قرۃ العین حیدر نے انگریزی ادب کا بھی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ یورپی ممالک کے سفر بھی کیے تھے اور وہاں تعلیم بھی دی تھی۔ لہٰذا اگر انہوں نے اپنے اُردو افسانوں اور ناولوں میں شعوری کی رو تکنیک کا ہندوستانی تاریخ اور یہاں کے تہذیبی، سماجی، جغرافیائی، مذہبی اور لسانی پس منظر میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

عینی آپا نے 20 جنوری 1927 کو اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں آپ کے والد سید سجاد حیدر یلدرم اُردو کے نامور اور صاحب طرز ادیب تھے اور والدہ گرامی نذر سجاد حیدر بھی ناول اور افسانے لکھتی تھیں۔ اس طرح فکشن نگاری انہیں والدین سے وراثت میں حاصل ہوئی تھی۔ لہٰذا اپنے گھر کے ادبی ماحول سے متاثر ہو کر قرۃ العین حیدر نے بھی ۱۱ برس کی عمر سے بچوں کے لیے کہانی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی پہلی کہانی بچوں کے رسالہ ''پھول'' میں شائع ہوئی تھی۔ ریڈیو پر بچوں کے پروگراموں میں بھی انہوں نے شرکت کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے محض 13 سال کی عمر میں ہی تجریدی وشعوری رو کی حامل کہانی لکھی تھی۔ خود عینی آپا نے ڈاکٹر شمع افروز زیدی صاحبہ کو 1979 میں دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں تسلیم کیا تھا کہ ''میری پہلی کہانی 1945 میں چھپی تھی۔ کہانی کا نام تھا ''یہ باتیں'' اور ''ہمایوں'' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی میں Abstract اور Stream of Consciousness تھی۔ گو کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیا لکھا تھا لیکن اس کا Credit مجھے نہیں ملا۔ آج 32 سال کے بعد پھر اس طرح کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جنہیں تجریدی افسانہ کہا جا رہا ہے حالانکہ یہ سب میں نے تب لکھا تھا جب میں ٹین ایجر تھی اور مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔'' (''فن کے آئینے میں'' از ڈاکٹر شمع افروز زیدی، صفحہ 132، مطبوعہ 2003)۔

قرۃ العین حیدر نے آگے چل کر اپنے افسانوں اور ناولوں میں شعوری کی رو تکنیک کا خوب استعمال کیا۔ ان کے افسانوی مجموعوں

''ستاروں سے آگے'' اور ''شیشے کے گھر میں'' ایسے افسانے شامل ہیں جن میں رومانیت کے ساتھ ساتھ جدت اور تاریخی شعور بھی ہے۔ مثلاً ''آئینہ فروش شہر کوراں''، ''روشنی کی رفتار''، ''سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات'' اور ''ملفوظات حاجی گل بابا'' وغیرہ میں زبان کی چاشنی بھی ہے اور تاریخ کا شعور بھی۔ اسی طرح عینی آپا کے ناولوں میں بھی جدت، شعور کی رو اور تاریخ کا ادراک موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا مشہور عالم ناول ''آگ کا دریا'' میں یوروپی تکنیک شعور کی رو کا نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے لیکن مصنفہ نے صرف تکنیک یوروپ سے لی ہے ورنہ ان کے کردار، تاریخ، زبان، جغرافیائی حالات، ناول کا پلاٹ، احساسات و جذبات اور ثقافتی و سماجی تانے بانے وغیرہ وغیرہ سب مشرقی اور ہندوستانی ہیں۔ اس ناول کا کردار گوتم نیلمبر لہروں کے خلاف تیرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل اس ناول میں دریا وقت کی علامات ہے۔ اسی

طرح ''آخر شب کے ہم سفر'' ناول میں بھی عینی آپا نے شعور کی رو تکنیک سے کام لیا ہے۔ یہ ناول 1942ء کی انقلابی تحریک، پاکستان کے مطالبہ، بنگال میں دہشت گردی، تقسیم ہند اور پھر بعد میں تقسیم پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے تمام کردار اپنی اپنی سطح پر ایک ہی ڈوری سے منسلک ہیں اور یہ ڈوری ہے وقت کی۔ عموماً قرۃ العین حیدر نے ذاتی تعصبات، مذہبی اور لسانی نظریات سے خود کو اپنی تخلیقات میں بلند رکھا ہے۔ وہ صرف انسانیت کے دُکھ درد کی عکاسی کرتی ہیں۔ لہذا ان کے چار افسانوی مجموعوں اور بارہ ناولوں میں آفاقیت ہے۔ اسی لئے عینی آپا کی ادبی اور لسانی اہمیت کو ان کی زندگی میں ہی تسلیم کیا گیا۔ اگر چہ انہوں نے دہلی یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی لیکن انہوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی، شکاگو یونیورسٹی، وسکونسن یونیورسٹی وغیرہ میں گیسٹ لیکچرار کے طور پر بھی کام کیا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وزیٹنگ پروفیسر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خان عبدالغفار خاں چیئر کی پروفیسر ایمیریٹس بھی رہیں۔ تاہم پیشے کے طور پر انہوں نے اپنے لیے صحافت کو منتخب کیا اور وہ انگریزی کی مشہور میگزین السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ایڈیٹوریل سے وابستہ رہیں اور انگریزی میگزین امپرنٹ کی مینجنگ ایڈیٹر بھی رہیں۔ قرۃ العین حیدر کی ادبی اہمیت اور تخلیقی عظمت کے پیش نظر انہیں غالب ایوارڈ، دہلی اُردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور 1989 میں اپنے ناول ''آخرِ شب کے مسافر'' پر وہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی اعزاز ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' سے نوازی گئیں۔ حکومتِ ہند نے بھی ان کی گراں قدر ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے 1984 میں پدم شری اور 2005 میں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

عینی آپا 1947 میں پاکستان ہجرت کر گئی تھیں لیکن پھر انہیں اس ملک میں گھٹن محسوس ہوئی تو وہ سیکولر ہندوستان میں واپس آ گئیں۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بہت زیادہ تو متاثر نہیں تھیں تاہم وہ وسیع النظر ضرور تھیں اور مسلکی و مذہبی حدود سے بالاتر تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے شادی نہیں کی اور نہایت وقار سے زندگی بسر کی۔ وہ شہرت اور نام و نمود کے لئے اپنی خود ہی مارکیٹنگ کرنے کے خلاف تھیں۔ عام طور پر انٹرویو دینے سے کتراتی تھیں لیکن غرور و تمکنت سے دور تھیں۔ کیوں کہ وہ اردو کی فکشن نگار تھیں۔ لہذا انہیں اپنے افسانوں، ناولٹ اور ناولوں سے شہرت و مقبولیت تو بہت زیادہ حاصل ہوئی لیکن معاوضہ کم ہی ملا۔ اسی لئے وہ بنگلے میں نہیں بلکہ نوئیڈا کے ایک فلیٹ میں رہیں حالانکہ ان کے والدین یوپی کے ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور والد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہ چکے تھے۔ اسی لئے عینی آپا کے افسانوں، ناولٹ اور ناولوں کے کردار عام طور پر طبقۂ اعلیٰ یا متوسط طبقے سے متعلق ہیں۔ البتہ کہیں کہیں انہوں نے غریب طبقے کے کرداروں کی بھی اپنے فکشن میں عکاسی کی ہے۔ 21 اگست 2007 کو اردو کی یہ عظیم ناول نگار اس عالم فانی سے رخصت ہو گئیں لیکن ان کے ادبی شاہکار اس عہد ساز فکشن نگار کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

Sana Asad

Add: 97-F, Sector-7, Jasola Vihar

New Delhi-110025

عذرا نقوی

زاہدہ زیدی

ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت

زاہدہ زیدی، پیدائش 1930 اور وفات 1911، ماڈرن اردو ادب کا ایک اہم اور منفرد نام ہے۔ سب سے پہلے مختصراً ایک بات کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں تانیثی ادب کے حوالے سے ان کے ادبی مقام پر ہرگز روشنی نہیں ڈال رہی ہوں، نہ ان کو ادب میں خواتین کی نمائندگی کے طور پر پیش کر رہی ہوں۔ زاہدہ زیدی اس سے ماورا ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے خود لکھا ہے "براہ کرم نقاد حضرات یا دوسرے ادیب و شاعر میری شاعری کو تانیثی چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جینوئن شاعری تانیثیت سے بھی بہت آگے کی چیز ہے، یہ ایک بلند تر سرورکار ہے جو اپنی افتاد میں ماورائیت سے ہمکنار رہے۔" اس ضمن میں انھوں نے کئی جگہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جو خود ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔

زاہدہ زیدی چالیس برس سے بھی زیادہ اپنے ادبی سفر میں کہیں ٹھہری نہیں ہمیشہ سرگرم رہیں، شاعری، تنقید، ڈراما، ناول، اور تراجم کی سولہ سے زیادہ کتابیں انھوں نے اردو ادب کو سونپیں۔ وہ ایک بے چین، مضطرب اور تخلیقی جوہر سے مالا مال ذہن کی مالک تھیں، ان کے احساس، شعور، علمیت اور بلاخوف سود و زیاں اپنی بات کہنے کی جرأت نے انھیں اردو ادب میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ایک عظیم وراثت انھیں مولانا حالی کے خانوادے سے ملی تھی۔ انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم انھوں نے علی گڑھ اور کیمرج میں حاصل کی، انگریزی ادب کی پروفیسر تھیں، عالمی ادب، مصوری، موسیقی سے انھیں گہرا شغف تھا، اس لیے ان کی تخلیقات میں افکار اور اظہار کی ایک انوکھی دنیا آباد ہے۔

انھوں نے کبھی خود کو ادبی نظریات اور گروہ بندی کا اسیر نہیں کیا، بس وہ تھیں اور ان کا تخلیقی انہماک اور جوش۔ لیکن میں یہاں یہ نہیں کہہ سکتی کہ ان کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پرواہ۔

سیاسی طور پر وہ زمانہ طالب علمی سے ہی کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھیں اور ترقی پسند ادیبوں سے بھی ان کی کافی رسم راہ رہی ہے۔ بلکہ انھوں نے خود کہیں لکھا ہے کہ میری شعر گوئی کا راز بھری بزم میں سردار جعفری نے فاش کیا تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ادب کی وہ برانڈ نہیں رہیں اور داخلیت سے لبریز ان کی آزاد نظمیں ان کی پہچان ہیں لیکن جدیدیت کے بینڈ ویگن پر بھی وہ سوار نہیں ہوئیں۔ شمیم حنفی نے بالکل صحیح کہا ہے "کہ زاہدہ زیدی کی فکر ایک واضح وجودی سطح رکھنے کے باوجود، اپنے گرد و پیش کی دنیا اور ماحول کی حقیقی دستاویز بھی ہے۔ جدیدیت کے انتہا پسندی کے دور میں بھی انھوں نے حقیقی زندگی کے آشوب، سیاسی اور نظریاتی اساس رکھنے والے واقعات پر اپنی توجہ قائم رکھی ہے۔ ان کی وابستگی اپنے انفرادی وجود سے رہی بھی تو اس طرح کہ عام زندگی اور زمانے کے مطالبات کا احساس مدھم نہ ہونے پائے۔"

اپنے شعری مجموعہ شعلہ جاں کے طویل پیش لفظ کے طور پر انھوں نے اپنی تخلیقات کے حوالے سے صنف شاعری، تخلیقی تجربات و عمل، لفظ اور معنی کے رشتے کی نوعیت وغیرہ پر ایک بصیرت افروز مضمون قلم بند کیا ہے، جس کا عنوان ہے "کسی رقاصہ معنی کو گرفتار کریں۔" یہ ان کے ہی ایک شعر کا مصرعہ ہے۔

تلخی زیست پہ لفظوں کی کمندیں ڈالیں
کسی رقاصہ معنی کو گرفتار کریں

یہ پیش لفظ ایک طرح سے ان کی شاعری کی شرح بھی ہے۔ اسی

رقاصہ معنی کو گرفت میں لاتے ہوئے انھوں نے شاعری کے پانچ مجموعے۔'زہر حیات'، 'دھرتی کا لمس'، 'سنگ جاں'، 'شعلۂ جاں'، اور 'شام تنہائی' تخلیق کیے۔ زاہدہ زیدی کی شاعری میں موضوعات اور انداز بیان کا تنوع ہے، شدت فکر و احساس ہے، زبان و بیان کے لطیف تجربے اور پیکر تراشی ہے، اور ایک معنی آفریں استعاراتی نظام ہے، جو خاص طور پر ان کی آزاد نظموں میں کمال دکھاتا ہے۔ آزاد نظم کے ارتقا میں ان کی شاعری ایک اہم کڑی ہے۔ ان کی غزلیں بھی مخصوص کیفیت کی حامل ہیں، یہاں ان کی ایک غزل کا صرف ایک شعر پیش کرنے پر اکتفا کرتی ہوں:

تخیل میں کہیں گرتے ہیں جب الفاظ کے جھرنے
تجھے اے شاعری ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

انھوں نے کچھ پابند اور کچھ نثری نظمیں بھی کہیں لیکن ان کی پہلی محبت ڈرامہ ہے۔ انگریزی ادب میں ان کا خاص موضوع بھی ماڈرن امریکن ڈرامہ تھا۔ ان کی ایک نظم ہے جو ڈرامے سے شغف کی غماز ہے۔

میں کب اس وادی کی باسی تھی
میں چنچل ناری اس گنجان نگر کی
جس میں
اونچی نیچی۔ گلیاں۔ شہتیر، منارے
گرد۔ بدن۔ کرنیں۔ انگارے
بات کے جھرنے، رات کا افسوں
دھوپ، اندھیرا، رمز، اشارے
رنگ کے بن، مٹی کے ستارے
میری مٹھی میں جاگ پڑے تھے
اپنے منہ سے بول پڑے تھے
مجھ کو جانے کس نے لاکر
اس وادی میں پھینک دیا ہے
جھیل کے گہرے پانی پر، احساس کی ٹوٹی کشتی میں
لفظوں کے ٹوٹے چپو لے کر، میں جانے کس اور چلی ہوں
گھور اندھیرا، تیز ہوا ہے، میں چنچل ناری اس گنجان نگر کی

تو بقول ان کے احساس کی ٹوٹی کشتی پر الفاظ کے ٹوٹے چپو ان کی شاعری کا اثاثہ تھے۔ لیکن ان کی نظموں میں بھی ڈرامائی عناصر رچے بسے ہیں۔ مکالمہ، خود کلامی اور ڈرامائیت سے بھرپور ان کی ایک معروف استعاراتی نظم، بند کمرہ ہے، اس نظم میں خود کلامی کو انھوں نے بہت نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

نظم یوں شروع ہوتی ہے:

دیکھو، پردوں کو اچھی طرح کھینچ دو
اور سب کھڑکیاں بند کردو
اور اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو

اس نظم میں ایک ڈرامائی کردار، دوسرے ڈرامائی کردار سے مخاطب ہے، جو اس کمرے کے مکین ہیں۔ نظم یوں ختم ہوتی ہے

دیکھو اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو
کیونکہ ممکن ہے اب تک وہی زخمی برہنہ بدن
باغ کے ایک کونے میں دم توڑتے ہوں
ہاں اگر ہوسکے تو کسی سے کہو
ان کے خوں گشتہ جسموں پہ
زرتار لفظوں کی پوشاک ڈھک کر
ان کو باہر پڑی کرسیوں پر بٹھا دے
تا کہ اس راہ کوئی گزرے
تو کہہ دے، کہ سب ٹھیک ہے
مگر پھر بھی سب کھڑکیاں بند رکھو
اور پردوں کو اچھی طرح کھینچ دو
اور اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو
دیکھو اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو

اور بھی نظمیں ہیں جو علامتی ڈراموں سے قریب تر ہیں۔ ان کی نظم دھرتی کا لمس، جس کا کینوس بہت وسیع ہے، اس میں داستان گو اور شکستہ راہی دو کردار ہیں۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے گزرا تھا کاروان شیشہ گراں۔ تم کو معلوم ہے پا شکستہ راہی...... نظم میں پا شکستہ راہی جو المناک تجربات سے گزرتا ہے اور داستان گو جوان تجربات اور ان کے پس منظر کی معنویت کو آشکار کرتا ہے۔

ان کی نظمیں 'اجنبی'، 'کتنے بہت راستے'، اور 'انوکھی حقیقت' میں مونتاژ کی فلمی تکنیک کی جھلک نظر آتی ہے۔ جس میں مجرد تصویریں ایک کے بعد ایک تیزی اور تسلسل کے ساتھ پردہ سیمیں پر نمودار ہوتی ہیں۔ ایک نظم دیکھیے:

پہلے سرشار لمحوں کے تھکے قدم درد کی سخت ٹہنی پہ مبہم سوالوں کی شبنم چلی......

نظم آگے بڑھتی ہے اگلا منظر آتا ہے۔

اس کے آگے گمانوں کے صحرا تھے افکار کی تنگ گلیاں تھیں مبہم

خیالات کے فاصلے تھے...... نظم آگے بڑھتی رہتی ہے ایک اور منظر شروع ہوتا ہے اور پھر لمس کی شوخ کلیاں کھلیں جسم کے باغ مہکے...... اسی طرح' اور پھر' کے ساتھ منظر بدلتے ہیں گویا ایک کے بعد ایک پردہ اٹھتا ہے اور نظم اپنی منزل کو پہنچتی ہے۔ اردو شاعری میں یہ تکنیک اختر الایمان کی کچھ نظموں میں شعوری طور پر لائی گئی ہے۔

ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'رموز و نکات' میں ڈرامے سے متعلق دو اہم مضامین شامل ہیں۔ پہلا 'انیس کی شاعری میں ڈرامائی عناصر' اور دوسرا 'اردو ڈرامہ: آزادی کے بعد'، آخر الذکر ایک اہم ادبی دستاویز ہے، جس میں اردو ڈرامے سے متعلق بہت سے موضوع پر مصنفہ نے اپنے مخصوص بے باکانہ انداز میں پرزور احتجاج کیا ہے لیکن بہت تفصیل سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے اردو ڈراموں پر تبصرہ کیا ہے۔ زاہدہ زیدی تحریر و تقریر دونوں میں اپنے بے لاگ اور بے باک انداز کے لیے مشہور تھیں۔ اس لیے اکثر لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

''انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے' نامی کتاب میں زاہدہ زیدی نے چیخوف کے دو ڈراموں۔ تھری سسٹرز(Three Sisters) اور چیری اور چرڈ (Cherry orchard) کا ترجمہ کیا ہے اور ڈرامے uncle vania کا 'حبیب ماموں' کے نام سے آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں چیخوف کی ڈرامہ نگاری پر مصنفہ نے ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اس کے علاوہ کارمنصبی کے سلسلے میں بزبان انگریزی بھی ان کے متعدد تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں اور دو شعری مجموعے beyond words اور broken mirror شائع ہو چکے ہیں۔

اردو میں ان کے طبع زاد ڈراموں پر جدید یورپین ڈرامے کے گہرے اثرات ہیں۔ ان کے طبع زاد ڈراموں کا ایک مجموعہ 'دوسرا کمرہ' ہے جس میں پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ پہلا ایک مختصر ڈرامہ 'چٹان'، وجودی طرز فکر کا مظہر ہے جس میں ڈرامہ در ڈرامہ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ڈرامہ 'دل ناصبور روادم' بھی علامتی انداز کا ہے جس میں راز اور ہمراز ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں جو ڈرامے کے نقطۂ عروج میں یکجا ہو کر فن کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ ڈرامہ 'دوسرا کمرہ' بھی نفسیاتی بصیرت کا حامل ایک علامتی ڈرامہ ہے۔ جس میں مرکزی علامت دوسرا کمرہ اور اس میں نمایاں ہونے والی لاشیں ہیں۔ اس میں ڈریم تکنیک کافی حد نظر آتی ہے۔ 'جنگل جلتا رہا' نو مناظر پر مشتمل ایک طویل ڈرامہ ہے، جس میں علامتی اظہار اور حقیقت کا سنگم ہے۔

لیکن اس مجموعے کا ڈرامہ 'وہ صبح کبھی تو آئے گی' موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے بہت مختلف ہے اور کناڈا میں 'تیسری دنیا' تھیٹر گروپ نے بہ کامیابی سے اسٹیج کیا تھا۔ ہندوستان میں یہ کہیں اسٹیج نہیں کیا گیا، حالانکہ اب بھی یہ ڈرامہ سماجی طور پر بہت relevant ہے۔ اس میں ہمارے سماج میں عورتوں کے استحصال، مظلومیت اور لوگوں کی اس بارے میں بے حسی کو بہت موثر ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے۔ اس کی تکنیک بہت دلچسپ ہے۔ ناظرین بیک وقت چار مختلف اور متضاد تاثرات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اول: مظلوم عورتوں پر ظلم و ستم اور زدوکوب، جو صرف پس پردہ آوازوں کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ دوم: رہ گیروں اور پڑوسیوں کے ردعمل۔ سوم: فلمی گانوں کے رومانی تصورات، اور چہارم: بالکونی کے شیشے پر رقص کرتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے متحرک سائے جو ہر چیز سے بے تعلق ہیں۔ یہ سب ڈرامائی عناصر مل کر سامعین کو مکمل طور پر باندھے رہتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈرامہ کلب کے بے لچک ضابطوں کی وجہ سے اکثر ان کو یونیورسٹی آڈیٹوریم کا اسٹیج نہیں ملتا تھا۔ زاہدہ زیدی کا ڈراموں سے عشق اس حد تک تھا کہ وہ اپنے یا کسی دوست کے گھر ہی ڈرامے اسٹیج کر لیتی تھیں۔ گھر کے برآمدے کو اسٹیج بنا لیا جاتا تھا اور آنگن میں کرسیاں ڈال کر ناظرین بیٹھ جاتے تھے۔ پروڈکشن کے سارے اخراجات وہ خود برداشت کرتی تھیں۔ ڈرامہ 'دوسرا کمرہ' اور چیخوف کے ڈرامے کا اردو ترجمہ 'تین بہنیں' انھوں نے ہی گھر میں اسٹیج کیا تھا۔ نصیر الدین شاہ جو اب بہت کامیاب فلمی اداکار ہیں، ان کی اداکاری کی

ابتدا زاہدہ زیدی کے ڈراموں سے ہی ہوئی تھی۔ ان کے کئی ڈرامے این سی ڈی کے اسٹیج پر دہلی میں اور بھوپال میں بھی اسٹیج کیے جاچکے ہیں۔

ان کا طویل ڈرامہ 'صحرائے اعظم' جو خلیجی جنگ کے تناظر میں لکھا گیا ایک سیاسی طنز ہے، اس پر تبصرے بھی ہوئے اور مذاکرہ بھی لیکن اس تجریدی ڈرامے کو اسٹیج کرنا کم از کم مجھے تو ایک کارِ اردو نظر آتا ہے۔ ان کا ایک اور طویل ڈرامہ ہے' کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز' جس میں انھوں نے ادبی دنیا میں گروہ بندی اور فارمولا بازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ یہ ڈرامہ بھی کہیں اب تک اسٹیج نہیں ہوا ہے۔ ویسے بھی ٹی وی اور فلم کے اس دور میں تھیٹر دیکھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی ہی جارہی ہے۔ بہرحال کہیں اسٹیج نہ سہی، زاہدہ زیدی کے کچھ ڈراموں کی پلے ریڈنگ تو کی ہی جاسکتی ہے تاکہ اردو ادب کے ڈراموں کی اردو روایت کو زندہ رکھا جاسکے۔

ان کے ناول 'انقلاب کا ایک دن' بھی اپنی طرز کا ایک منفرد ناول ہے جو مختلف ڈرامائی عناصر سے سجا ہوا ہے۔ اس ناول کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ گویا سوانح، فکشن کے translucent پردے میں ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اسے کیمپس ناول قرار دیا ہے۔ ناول میں ماجرا صرف ایک دن کا ہے لیکن بات پورے ایک عہد کی ہے، ناول میں تین محور ہیں، ایک مرکزی کردار، بائیس سالہ روشن خیال لڑکی صادقہ علوی مع اپنے خاندانی پس منظر کے، دوسرا ہندوستان کی آزادی کے بعد، پچاس کی دہائی کے اواخر میں ملک میں کمیونسٹ پارٹی کا رویہ خصوصاً اے۔ ایم۔ یو میں اور تیسرا یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کا احوال جہاں صادقہ پڑھتی ہے۔ ناول میں کہیں بھی اے۔ ایم یو کا ذکر نہیں ہے مگر پھر بھی اے ایم یو سے واقفیت رکھنے والے لوگ فرضی ناموں کے پردے میں اصل شخصیات کو بخوبی پہچان لیتے ہیں۔ لیکن ناواقف قاری کے لیے ناول کی معنویت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس ناول میں کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیاں اور کامریڈوں کی سخت گیری اور تنگ نظری، طلبا کی بھوک ہڑتال اور احتجاج اور اس پر پولس کے مظالم، صادقہ کا گھر، جہاں وہ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ رہتی تھی، کامریڈوں کی آماجگاہ تھا مارکس مینشن کہلاتا تھا، صادقہ کی نظریاتی اور جذباتی کشمکش، سب مل کرا سے بہت ریڈایبل بنادیتے ہیں۔ ہاں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ مصنفہ اس ناول کو وسیع تر کینوس پر بھی پھیلا سکتی تھیں، لیکن انھوں نے ایک عہد کو، ایک دن کی روداد کی شکل میں سمیٹنے پر کیوں اکتفا کیا جب کہ وہ ایک طویل ناول لکھنے کی پوری طرح اہل تھیں۔ کئی بار سوچا بھی ان سے یہ بات پوچھوں گی، لیکن وقت نے مہلت ہی نہیں دی۔ آخر میں ان کی ایک نظم 'موت' کی کچھ لائنیں:

موت، اے موت! تیری خموشی کے اسرار کھلتے نہیں
تو ہے صہبائے ہستی کا ایک جرعۂ آخریں
یا کہ تعبیرِ خوابِ گراں
کب سے اس روز وشب کے بیابان میں
تیری خاموش آہٹ سے میں پابہ زنجیر ہوں
گر یہ زنجیر ٹوٹے تو پھر میں کہاں..... تو کہاں

☆☆☆

فرہنگِ آصفیہ سے

سبزوار۔ ایران کے ایک شہر کا نام جہاں کے اولیاء اللہ مشہور ہیں۔ چنانچہ شمس الدین سبزواری جن کا مزار ملتان میں ہے وہیں کے رہنے والے ہیں محمد عمار حسن بن سلطان علی سبزواری نے ہی سنہ ۱۰۱۴ھ میں حضرت امیر خسرو کے مزار مبارک کا گنبد تعمیر کرایا تھا۔

آوا۔ اسم مذکر۔ ف۔ (آوہ) از (تقابس) انگریزی اوون (oven) سکسن افن (ofen) عربی میں اتون۔ کمہار کی بھٹی۔ کمہاروں کے برتن پکانے کا گڑھا۔ پزاوہ۔ بھٹا۔ (مثلیں) ماں کا پیٹ کمہار کا آوا کوئی کالا کوئی گورا۔ ایک آوے کے برتن ہیں۔ (فقرہ) کسی کا آوا بگڑے انکے کھد انکا کھد انہ بگڑا ہوا ہے۔

محمد اعجاز

دیہی خواتین : خودمختاری کی طرف بڑھتے قدم

اس میں کوئی شک نہیں کہ حال میں دیہی خواتین میں بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اسی جذبے نے اسے بلند مقام عطا کیا ہے- یہ خواتین دوسری خواتین کے لیے رول ماڈل ثابت ہوئی ہیں اور خواتین کی خودمختاری کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ذیل میں ہندوستان کی کچھ ایسی دیہی خواتین کا ذکر کررہے ہیں جنھوں نے اپنے عظیم کارنامے کی وجہ سے اپنا اور ملک کا نام روشن کیا ہے۔

کلپنا سروج

کلپنا سروج مہاراشٹر کے روپ کھیڑا گاؤں کے دلت خاندان میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے کم عمری میں خودکشی کی بھی کوشش کی۔ ان کی شادی محض بارہ سال کی عمر میں کردی گئی تھی۔ شوہر کے خاندان میں انھیں جسمانی سزائیں دی گئیں۔ انھوں نے شوہر کے ساتھ گھر چھوڑ دیا - پھر وہ تنگ بستیوں میں رہنے لگیں۔ اسی جگہ انھوں نے اپنی زندگی بدلی -تنگ بستیوں کی خواتین کو متحد کیا۔ پہلے سلائی کا کاروبار شروع کیا پھر ایک چھوٹی گارمنٹ فیکٹری اس کے بعد فرنیچر اسٹور - اب وہ ایک کامیاب خاتون کاروباری ہیں اور ڈھیر ساری خواتین کو روزگار فراہم کرتی ہیں۔ انھوں نے تنگ بستیوں کی تمام خواتین اور خاندانوں کی حالت بدل دی۔ کچھ وقت پہلے ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی نے پدم شری ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے بعد وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ خواتین خودمختاری کی شمع روشن کرنے لگ گئیں۔

ڈالیمی پٹ گیری، آسام

وہ آسام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی ڈالیمی نے دیگر خواتین کے ساتھ مل کر کچے سامانوں سے گھر میں استعمال کی جانے والی چیزیں بنانی شروع کیں۔ اب نہ صرف ان کی بلکہ ان کے ساتھ کام کرنے والی خواتین کی مالی حالت بدل گئی ہے اوراب یہ سب مل کرگاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں بیداری مہم چلا رہی ہیں۔ ان سبھی خواتین میں ایک نیا شعور اور خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے۔

ہرداما کی سرپنچ نوروتی

نوروتی بچپن ہی سے انصاف کی لڑائی لڑ رہی ہیں - راجستھان کے کشن گڑھ ضلع کے ہرداما گاؤں میں نوروتی کا جنم ایک دلت خاندان میں ہوا - اب وہ اسی گاؤں کی سرپنچ ہیں - پہلے انھوں نے گاؤں کی خواتین مزدوروں کے لیے مناسب اجرت کی لڑائی لڑی - وہ خود بھی پتھر کاٹنے کا کام کرتی تھیں- ان کی جدوجہد نے ثابت کردیا کہ خواتین کی طاقت کسی سے کم نہیں ہوتی - نوروتی پڑھی لکھی نہیں تھیں - بعد میں انھوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا۔ اب سرپنچ بننے کے بعد وہ کمپیوٹر پر بھی اپنا کام خود کرتی ہیں۔ اب وہ اپنے گاؤں کی تمام خواتین کے لیے رول ماڈل ہیں۔

انجم آرا

آئی پی ایس انجم آرا، کی پیدائش لکھنؤ کے اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کمہریا میں ہوا - اب وہ ملک کی مسلم خاتون آئی پی ایس ہیں - جب پڑھائی پوری کرنے کے بعد آئی پی ایس بننے کی خواہش والد کو بتائی تو انھوں نے حوصلہ افزائی کی - لیکن خاندان کے دیگر افراد اس سے خوش نہیں تھے- رشتہ داروں کو تو اس کا گھر سے نکلنا تک گوارا نہیں تھا - انجم کہتی ہیں کہ ان کے خاندان میں پردہ کی رسم جاری ہے - کڑی محنت اور لگن سے 2011 میں ان کا انتخاب آئی پی ایس کے لیے ہو گیا-

اینج کانمنی، جائے

کیرل کے ایک گاؤں کے کسان نے خواب دیکھا تھا کہ اس کی بیٹی آئی اے ایس بنے۔ اسی خواب کے ساتھ اس نے اپنی بیٹیوں کو بہترین تعلیم دی۔ تقریباً تین سال پہلے اس کسان کی ایک بیٹی اینج کانمنی جائے Annis Kanmani Joy سول سروس کا امتحان 2012 پاس کرنے میں کامیاب رہیں۔ اینج نے نہ صرف 2012 میں امتحان میں کامیابی حاصل کی بلکہ 65 واں رینک حاصل کیا - ایسا نہیں ہے کہ اینج نے یہ پہلی بار کیا ہے۔ 2011 میں بھی اینج نے سول سروس پاس کی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ دیہی پس منظر خاص معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ ترقی کے لیے حوصلہ ہونا چاہیے۔

شریمتی ڈی جیوتی ریڈی

شریمتی ڈی جیوتی ریڈی کی کہانی خواتین خودمختاری کی ایک اور زبردست مثال ہے۔ حیدرآباد کے وارنگل میں رہنے والی جیوتی نے اپنی جدوجہد سے جو ترقی حاصل کی ہے وہ یقیناً ناقابل یقین لگتا ہے۔ وہ کاشت

کار مزدوری کی شکل میں 1989 میں محض پانچ روپے کی یومیہ مزدوری پر کام کرتی تھیں ۔ ساتھ ہی پڑھائی بھی ۔ وہ اب امریکا کے کیج سافٹ ویر سالوشنس میں سی ای او ہیں اور کمپنی کے لیے اربوں روپے کمارہی ہیں لیکن جیوتی اس بات کو کبھی نہیں بھولتی کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتی ہیں ۔ کیسے وہ آگے بڑھ کر یہاں تک پہنچی ہیں ۔ وہ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں موجود خواتین کی مدد کرتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ وہ ان کے ذریعے کئے جارہے رفاہی کاموں سے اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔

ستیہ منگل کی دیہی خواتین

تمل ناڈو کی اس گاؤں کی خواتین کو لمبی مدت سے نظر انداز کیا جارہا تھا۔لیکن ماس میڈیا اور تکنیک کے اس دور میں انھوں نے اپنی خودمختاری کا نیا راستہ تلاش کرلیا ہے۔وہ ویڈیو کیمرے کے ذریعے گاؤں کے تمام مسائل اور پریشانیوں کی فلم تیار کرتی ہیں۔ اسے افسران کے پاس بھیجتی ہیں۔اس کا بہت زیادہ مثبت اثر پڑا ہے۔گاؤں میں اس کے ذریعے کئی کام ہوئے ہیں۔ کچھ سال پہلے ایک عالمی ادارے نے گاؤں میں اس کے لیے ورک شاپ کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں انھیں فلم سازی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ یہ بتایا گیا کہ کس طرح اس کے ذریعے وہ مضبوط ڈھنگ سے ظلم وزیادتی کے چنگل سے آزاد ہوسکتی ہیں اور جب وہ ان باتوں کی فلم تیار کریں گی تو اسے نظر انداز کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ستیہ منگل کی خواتین نے فلم سازی کی تکنیک میں مہارت حاصل کی۔ انھوں نے جو فلمیں بنائیں وہ پسند کی گئیں اور ان کا اثر ہوا۔اب یہ خواتین اتنی مشہور ہوچکی ہیں کہ انھیں آس پاس کے علاقوں میں بلاکر لوگ اپنے مسائل بتاتے ہیں۔ وہ اس کی فلم تیار کرتی ہیں۔صرف اتنا ہی نہیں وہ آس پاس کے علاقوں کی خواتین کو اس ہنر سے واقف کرارہی ہیں۔

شکھاوٹی کی لڑکیاں

جب آپ راجستھان کے شکھاوٹی علاقے کے گاؤں میں جائیں گے تو وہاں آپ کئی مثالیں دیکھیں گے۔ وہاں کی لڑکیاں فوج میں بھرتی ہورہی ہیں۔ ان میں سے کچھ افسر بھی بنی ہیں ۔ کچھ جہاز کی پائلٹ بن کر خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔ کچھ سال پہلے جب انڈیا گیٹ پر واقع راج پتھ پر یوم جمہوریہ کی پریڈ ہوئی تو سنیہا شیخاوت نے ہوائی فوج کی ٹکڑی کی نمائندگی کی تھی۔ اس خاص موقع پر فوج کی کسی ٹکڑی کی نمائندگی کرنے والی یہ ملک کی پہلی خاتون فوجی افسر تھیں۔ ان کے خاندان کی جڑیں شخاوٹی کے گاؤں میں ہیں۔ ان کی اس کامیابی نے شخاوٹی کے گاؤں کی تمام لڑکیوں کو فوج میں آنے کے لیے راغب کیا۔ انھی میں ایک دینا سہارن بھی ہے۔ وہ آج آئی ایل 76 نام کا جہاز اڑارہی ہیں۔ اس جہاز کو اڑانے والی وہ ملک کی پہلی خاتون پائلٹ ہیں۔ پہلے اس جہاز کو مرد پائلٹ ہی اڑایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئی ایل 76 کا وزن 190 ٹن ہوتا ہے اور آمدورفت کے حساب سے یہ ملک کا پہلا جہاز ہے۔ وہ شخاوٹی کے چورو ضلع میں رتن پورا گاؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے خاندان کے کئی لوگ پہلے سے فوج میں ہیں۔ دینا کہتی ہیں کہ لڑکیاں چاہے شہری ہوں یا گاؤں کی، قابلیت سب میں ہوتی ہے۔ ضرورت بس اس بات کی ہے کہ والدین کی طرف سے تھوڑی حوصلہ افزائی کی جائے۔ شیخاوٹ کے حوصلے سے متاثر ہوکر پڑوسی ضلع میں بیداری پھیل رہی ہے۔ سیکر سے متصل ناگور ضلع کے ڈیڈوانا کے چھوٹے گاؤں بھوادیا کی 27 سالہ دیپکا راٹھوڑ نے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کی۔ اب فوج میں افسر ہیں۔ راجستھان کے کئی ایسے گاؤں ہیں جہاں کی خواتین نے خاتون خودمختاری کی مثال قائم کی ہے۔

ترن تارن کی لڑکیاں

پنجاب کے ضلع ترن تارن کے گاؤں پنڈوری سدھواں کو فوجیوں کا گاؤں کہا جاتا ہے۔ یہاں کے کئی جوان فوج، بی ایس ایف، سی آر پی ایف اور پنجاب پولیس میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ محض 3500 کی آبادی والے اس گاؤں میں اب لڑکیاں بھی فوج اور پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے تیاری میں مشغول ہیں۔ کچھ منتخب ہوچکی ہیں اور گاؤں اور آس پاس کے علاقوں کے لیے رول ماڈل کا کام کررہی ہیں۔

پشپا مترئی

ادبی زندگی میں پشپا مترئی کا نام جانا پہچانا ہے۔ ان کی پیدائش بندیل کھنڈ کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ شروعاتی تعلیم بھی گاؤں میں ہوئی۔ جب انھوں نے ہائی اسکول پاس کرلیا تو انٹرمیڈیٹ کے لیے نزدیک کے ایک قصبے میں جانا پڑا۔ وہ روزانہ 20-15 کیلومیٹر جاتی تھیں۔ اسی طرح جب انھوں نے کالج کی پڑھائی شروع کی تو یہ ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے مضبوط قوت ارادی سے یہ کر دکھایا۔ ان کے ذریعہ تحریر کیے گئے شہپاروں کا ماحول دیہی ہوتا ہے۔ وہیں وہ خواتین کی خودمختاری کا احساس بھی دلاتا ہے۔ بلکہ ان کے کردار عام طور پر گاؤں سے ہی لیے گئے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ موجودہ عہد میں گیس کے چولہوں اور موبائل فون نے خواتین کی تصویر بدلنے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔

Md Aijaz
Raja Tola Harlakhi
P.O. Harlakhi, Via - Umgaon Kothi
Distt. Madhubani-847240 (Bihar)

گذشتہ سے پیوستہ

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کا قانون

(ج) متاثرہ شخص کے کام کاج کی جگہ میں داخل ہونا، یا اگر متاثرہ شخص بچہ ہو تو اسکول یا کسی دوسری جگہ میں داخل ہونا جہاں متاثرہ شخص کا اکثر آنا جانا ہو؛

(د) متاثرہ شخص کے ساتھ کسی بھی طرح رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا جس میں ذاتی، زبانی یا تحریری یا الیکٹرانک یا ٹیلیفون رابطہ بھی شامل ہے؛

(ہ) مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر اثاثے منتقل کرنا، بینک لاکر یا بینک کھاتوں کا تصرف جن کو متاثرہ شخص اور مسئول الیہ دونوں فریق مشترکہ طور پر یا مسئول الیہ اکیلے استعمال کرتا تھا یا ان کے قبضے میں تھا اور ان میں خاتون کا استری دھن یا دیگر کوئی جائداد شامل ہے جو فریقین کے مشترکہ قبضے میں تھی یا اس پر علاحدہ علاحدہ قبضہ رکھتے تھے؛

(و) لواحقین، دیگر رشتہ داروں یا کسی شخص کو تشدد کا نشانہ بنانا جس نے متاثرہ شخص کو گھریلو تشدد سے بچانے میں مدد دی؛

(ز) حکم تحفظ میں مصرحہ کسی دیگر فعل کا ارتکاب۔

سکونت

19- (1) دفعہ 12 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت درخواست کا نپٹارا کرتے وقت مجسٹریٹ یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد کہ گھریلو تشدد واقع ہوا ہے، حکم سکونت صادر کر سکے گا جس سے:-

(الف) مسئول الیہ کو مشترکہ گھر سے متاثرہ شخص کو نکالنے یا کسی دوسرے طریقے سے اس کے قبضے میں خلل ڈالنے سے باز رکھا جائے گا چاہے مسئول الیہ کو مشترکہ گھر میں کوئی قانونی یا منصفانہ مفاد ہو یا نہ ہو؛

(ب) مسئول الیہ کو ہدایت دی جا سکے گی کہ وہ مشترکہ گھر سے نکل جائے؛

(ج) مسئول الیہ یا اس کے کسی رشتہ دار کو مشترکہ گھر کے کسی ایسے حصہ میں داخل ہونے سے باز رکھا جا سکے گا جہاں متاثرہ شخص رہائش پذیر ہو؛

(د) مسئول الیہ کو مشترکہ گھر منتقل کرنے یا فروخت کرنے یا اسے رہن کے زیر بار بنانے سے باز رکھا جا سکے گا؛

(ہ) مسئول الیہ کو مشترکہ گھر میں اپنے حقوق سے مجسٹریٹ کی اجازت کے سوا دست بردار ہونے سے باز رکھا جا سکے گا؛

(و) مسئول الیہ کو ہدایت دی جا سکے گی کہ وہ متاثرہ شخص کے لیے اسی درجہ کی متبادل رہائش حاصل کرے جس درجہ کی رہائش اسے مشترکہ گھر میں میسر تھی یا اگر حالات کا تقاضا ہو تو اسے ایسی رہائش کے لیے کرایہ ادا کرے:

لیکن شرط یہ ہے کہ فقرہ (ب) کے تحت کسی ایسے شخص کے خلاف حکم صادر نہ ہوگا جو ایک خاتون ہو۔

(2) مجسٹریٹ کوئی مزید شرائط عائد کر سکے گا یا کوئی دیگر ہدایت جاری کر سکے گا جو وہ متاثرہ شخص یا ایسے متاثرہ شخص کے بچے کے تحفظ یا اس کی سلامتی کا انتظام کرنے کے لیے مناسب طور پر ضروری تصور کرے۔

(3) مجسٹریٹ مسئول الیہ کو کہہ سکے گا کہ وہ گھریلو تشدد روکنے کے لیے ایک مچلکہ ضامنوں کے ساتھ یا ان کے بغیر پیش کرے۔

(4) ذیلی دفعہ (3) کے تحت کوئی حکم مجموعہ ضابطہ فوجداری 1973 کے

باب viii کے تحت ایک حکم تصور ہوگا اور اسی کے مطابق اس کا نپٹارا ہوگا۔

(5) ذیلی دفعہ (1)، ذیلی دفعہ (2) یا ذیلی دفعہ (3) کے تحت حکم صادر کرتے وقت عدالت ایک ایسا حکم بھی صادر کر سکے گی جس کے ذریعے نزدیک ترین پولس اسٹیشن کے نگراں افسر کو ہدایت دی جا سکے گی کہ وہ متاثرہ شخص کو تحفظ فراہم کرے یا اسے یا اس کی جانب سے درخواست دینے والے شخص کو حکم کی عمل آوری میں مدد دے:

(6) ذیلی دفعہ (1) کے تحت حکم صادر کرتے وقت مجسٹریٹ مسئول الیہ پر کرایہ یا دیگر ادائیگیوں کی ذمہ داری عائد کر سکے گا اور ایسا کرتے ہوئے وہ فریقین کی مالی ضرورتوں اور وسائل کو ملحوظ رکھے گا۔

(7) مجسٹریٹ اس پولس اسٹیشن، جس کے حدود اختیار میں مجسٹریٹ سے رجوع کیا گیا ہو، کے نگراں افسر کو ہدایت دے سکے گا کہ وہ تحفظ حکم کو روبہ عمل لانے میں مدد دے۔

(8) مجسٹریٹ مسئول الیہ کو ہدایت دے سکے گا کہ وہ متاثرہ شخص کو اس کا استری دھن یا دیگر کوئی جائیداد یا قیمتی مالی وثیقے قبضہ میں دے جس کی کہ وہ خاتون مستحق ہو۔

مالی امداد (راحت)

20- (1) دفعہ 12 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت درخواست پر فیصلہ دیتے وقت مجسٹریٹ مسئول الیہ کو ہدایت دے سکے گا کہ وہ گھریلو تشدد کے باعث متاثرہ شخص اور متاثرہ شخص کے کسی بچے کے ذریعے کیے گئے اخراجات یا برداشت کیے گئے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے امداد کرے اور ایسی امداد میں صرف حسب ذیل کو ہی شامل کرنا محدود نہیں ہوگا:

(الف) کمائی میں نقصان؛

(ب) طبی اخراجات؛

(ج) متاثرہ شخص کے قبضہ میں کسی جائداد کو تلف کرنے، نقصان پہنچانے یا اس کے قبضے سے ہٹانے کے باعث نقصان؛

(د) متاثرہ شخص اور اس کے بچوں، اگر کوئی ہوں، کے لیے نان نفقہ اس میں مجموعہ ضابطہ فوجداری، 1973 کی دفعہ 125 یا فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون کے تحت یا نان نفقہ کے حکم کے علاوہ کوئی حکم شامل ہے۔

(2) اس دفعہ کے تحت منظور کی گئی مالی امداد خاطر خواہ، واجب اور مناسب ہوگی اور متاثرہ شخص کے معیار زندگی، جس کا وہ عادی ہو، کے مطابق ہوگی۔

(3) مجسٹریٹ کو اختیار ہوگا کہ وہ نان نفقہ کے طور پر مناسب یکمشت رقم کی ادائیگی یا ماہوار ادائیگی کا حکم دے جیسا کہ معاملہ کے حالات تقاضا کریں۔

(4) مجسٹریٹ ذیلی دفعہ (1) کے تحت مالی امداد کے لیے صادر کیے گئے حکم کی نقل درخواست کے فریقین اور پولس اسٹیشن کے نگراں کو ارسال کرے گا جس کے مقامی حدود اختیار کے اندر مسئول الیہ رہائش پذیر ہو۔

(5) مسئول الیہ منظور کی گئی مالی امداد متاثرہ شخص کو ذیلی دفعہ (1) کے تحت حکم میں مصرحہ مدت کے اندر ادا کرے گا۔

(6) مسئول الیہ ذیلی دفعہ (1) کے تحت حکم کے معنوں میں ادائیگی کرنے سے قاصر رہا تو مجسٹریٹ مسئول الیہ کے آجر یا قرض دار کو ہدایت دے سکے گا کہ وہ مسئول الیہ کو واجب الادا اجرتوں یا مشاہرہ یا قرضہ کے ایک حصہ کو براہ راست متاثرہ شخص کو ادا کرے یا عدالت میں جمع کرے اور یہ رقم مسئول الیہ کی طرف سے واجب الادا مالی امداد میں مجرا کی جا سکے گی۔

حکم تحویل

21- فی الوقت نافذ العمل دیگر کسی قانون میں مندرج کسی امر کے باوجود مجسٹریٹ حکم تحفظ یا اس ایکٹ کے تحت کوئی دوسری امداد منظور کرنے کے لیے درخواست کی سماعت کے کسی مرحلہ پر کسی بچہ یا بچوں کی عارضی تحویل متاثرہ شخص کو یا اس خاتون کی طرف سے درخواست دینے والے شخص کو منظور کر سکے گا اور اگر ضروری ہو تو اس انتظام کی صراحت کرے جس کے مطابق مسئول الیہ بچوں سے ملاقات کر سکے گا:

لیکن شرط یہ ہے کہ اگر مجسٹریٹ کی رائے ہو کہ مسئول الیہ کی کوئی ملاقات بچہ یا بچوں کے مفاد کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے تو مجسٹریٹ ایسی ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر سکے گا۔

حکم معاوضہ

22- اس ایکٹ کے تحت دی جانے والی امداد کے علاوہ مجسٹریٹ متاثرہ شخص کی طرف سے درخواست دینے پر ایک حکم صادر کر سکے گا جس کے ذریعے مسئول الیہ کو ہدایت دی جا سکے گی کہ وہ گھریلو

تشدد کے اپنے افعال کے ارتکاب سے ہوئے ضرر کے لیے جس میں ذہنی اور جذباتی ایذا رسانی شامل ہیں، معاوضہ اور ہرجانہ ادا کرے۔

عبوری ویکطرفہ احکام صادر کرنے کا اختیار

23- مجسٹریٹ اس ایکٹ کے تحت اپنے سامنے کسی کارروائی میں ایسا عبوری حکم صادر کر سکے گا جسے وہ منصفانہ اور مناسب تصور کرے۔

(2) اگر مجسٹریٹ مطمئن ہو جائے کہ کسی درخواست سے بادی النظر میں اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ مسئول الیہ گھریلو تشدد کا ارتکاب کر رہا ہے یا اس نے اس کا ارتکاب کیا ہے یا یہ کہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ مسئول الیہ گھریلو تشدد کے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا تو وہ مسئول الیہ کے خلاف دفعات 21,20,19,18 یا جیسی کہ صورت ہو، دفعہ 22 کے تحت متاثرہ شخص کی طرف سے ایسے فارم میں جو مقرر کیا جائے، بیان حلفی کی بنیاد پر یکطرفہ حکم منظور کر سکے گا۔

سلوچنا بنام کیپٹن والے معاملے میں (2007 (3) جے سی سی 2076 (کیرالہ)) کیرالہ ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ دفعہ 29 کی سادہ زبان اور نفس موضوع سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس دفعہ میں حکومت کی اصطلاح میں دفعات 18 تا 23 میں شامل تمام احکامات آتے ہیں۔

ایکٹ ہذا کی دفعہ 23 کے تحت صادر کیے گئے حکم کے خلاف کوئی نگرانی (Revision) داخل نہیں کی جا سکتی البتہ دفعہ 29 کے تحت اپیل کی جا سکتی ہے۔

کیرالہ ہائی کورٹ نے چندر شیکھرن بنام سیما والے معاملے میں ((4) 2007 کیرالہ ٹائمز 424 ص 429 (کیرالہ)) اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

عدالت حکم کی نقول مفت دے گی

24- مجسٹریٹ ایسے تمام معاملات میں، جن میں اس نے اس ایکٹ کے تحت کوئی حکم صادر کیا ہو، حکم دے گا کہ ایسے حکم کی نقل درخواست کے فریقین، پولیس اسٹیشن کے نگراں افسر جس کے حدود اختیار میں مجسٹریٹ سے رجوع کیا گیا ہو، خدمت فراہم کنندہ جو عدالت کے مقامی حدود اختیار کے اندر واقع ہو اور اگر خدمت فراہم کنندہ نے گھریلو تشدد کی رپورٹ درج کرائی ہو تو ایسے خدمت فراہم کنندہ کو مفت فراہم کی جائے گی۔

اس ضمن میں کیرالہ ہائی کورٹ نے جوز بنام ریاست کیرالہ والے معاملے میں (2007(2) کیرالہ ٹائمز 386 ص 387) یہ فیصلہ دیا ہے کہ ایکٹ ہذا کی دفعہ 24 میں فریقین و مصرحہ دیگر لوگوں کو حکم کی نقل حکم صادر کرنے کے بعد دی جانی چاہیے۔

احکام کی میعاد اور تبدیلی

25- (1) دفعہ 18 کے تحت حکم تحفظ اس وقت تک نافذ رہے گا جب تک کہ متاثرہ شخص اس کی منسوخی کے لیے درخواست دے۔

(2) اگر مجسٹریٹ متاثرہ شخص یا مسئول الیہ سے درخواست موصول ہونے پر مطمئن ہو جائے کہ حالات میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور وہ اس ایکٹ کے تحت صادر کیے گئے کسی حکم کو تبدیل کرنے، اس میں رد و بدل کرنے یا منسوخ کرنے کا تقاضا کرتے ہیں تو وہ ایسی وجوہات کی بنیاد پر، جنھیں قلم بند کیا جائے، ایسا حکم صادر کر سکے گا جسے وہ مناسب تصور کرے۔

اس ضمن میں دہلی ہائی کورٹ مایا دیوی بنام این سی ٹی دہلی والے معاملے میں (2007) (4) جے سی سی 2819 ص 2819 تا 2821 دہلی یہ فیصلہ دیا ہے کہ مجسٹریٹ کے حکم کے خلاف اپیل تو کی جا سکتی ہے لیکن رٹ تب تک داخل نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اپیل جیسی دادرسی کا فائدہ نہ اٹھالیا گیا ہو۔ اس ضمن میں عدالت نے ایکٹ ھذا کی دفعہ 25 اور 29 کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ اس کو ایسی صورت حال میں اس عدالت میں رٹ فائل نہیں کرنی چاہیے تھی۔

دیگر مقدموں اور قانونی کارروائیوں میں راحت

26- (1) دفعات 21,20,19,18 اور 22 کے تحت دستیاب راحت کسی دوسری قانونی کارروائی میں بھی مانگی جا سکے گی جو کسی دیوانی عدالت، خانگی معاملات عدالت یا فوجداری عدالت میں رواں ہوں جن کا تعلق متاثرہ شخص اور مسئول الیہ سے ہونا چاہیے ایسی کارروائی اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے یا اس کے بعد دائر کی گئی ہو۔

(2) ذیلی دفعہ (1) میں محولہ کوئی راحت کسی دیوانی یا فوجداری عدالت کے پاس ایسے مقدمے یا قانونی کارروائی میں متاثرہ شخص کے ذریعے مانگی جانے والی راحت کے علاوہ اور اس کے ساتھ ساتھ مانگی جا سکے گی۔

(3) اگر متاثرہ شخص نے اس ایکٹ کے تحت کسی کارروائی کے سوا کسی کارروائی میں راحت حاصل کی ہو تو وہ خاتون ایسی راحت کی منظوری کی نسبت مجسٹریٹ کو مطلع کرنے کی پابند ہوگی۔

حدود اختیار

27- (1) جوڈیشل مجسٹریٹ درجہ اول یا میٹرو پالٹن مجسٹریٹ کی عدالت، جیسی کہ صورت ہو، جس کے مقامی حدود کے اندر:۔

(الف) متاثرہ شخص مستقل یا عارضی طور پر رہائش پذیر ہو یا کاروبار چلاتا ہو یا کام کاج کرتا ہو؛ یا

(ب) مسئول الیہ رہائش پذیر ہو یا کاروبار چلاتا ہو یا کام کاج کرتا ہو؛ یا

(ج) بنائے دعویٰ پیدا ہوا ہو۔

اس ایکٹ کے تحت حکم تحفظ اور دیگر احکام صادر کرنے اور اس ایکٹ کے تحت جرائم کی سماعت کرنے کے لیے مجاز عدالت ہوگی۔

(2) اس ایکٹ کے تحت صادر کیا گیا کوئی حکم پورے بھارت میں نافذ العمل ہوگا۔

اس ضمن میں کیرالہ ہائی کورٹ نے موئی بنام لیلما والے معاملے میں (2007)(3) جے بی سی 2113 (کیرالہ) یہ فیصلہ دیا ہے کہ جوڈیشل مجسٹریٹ درجہ اول یا میٹرو پولس مجسٹریٹ اپنی علاقائی حدود میں مستقل طور پر یا عارضی طور پر رہائش پذیر کسی بھی متاثرہ شخص کو راحت دے سکتا ہے اور متعلقہ معاملے کی سماعت کا پورا پورا مجاز ہے۔

ضابطہ فوجداری کا لاگو ہونا

28- (1) بجز اس کے کہ اس ایکٹ میں دیگر طور پر توضیع کی گئی ہے، دفعات 12، 18، 19، 20، 21، 22 اور 23 کے تحت تمام کارروائیوں اور دفعہ 31 کے تحت جرائم پر مجموعہ ضابطہ فوجداری 1973ء کی توضیعات لاگو ہوں گی۔

(2) ذیلی دفعہ (1) میں مندرج کوئی امر دفعہ 12 کے تحت یا دفعہ 23 کی ذیلی دفعہ (2) کے تحت درخواستوں کو نمٹانے کے لیے عدالت کو اپنا ضابطہ طے کرنے سے باز نہیں رکھے گا۔

اپیل

29- مجسٹریٹ کے ذریعہ صادر کیے گئے حکم کے خلاف اپیل حکم کی متاثرہ شخص پر تعمیل یا مسئول الیہ پر تعمیل، جیسی کہ صورت ہو، کیے جانے کی تاریخ، جو بھی بعد میں ہو، سے 30 دنوں کے اندر سیشن عدالت میں دائر کی جاسکے گی۔

باب-۷

متفرقات

تحفظ افسران اور خدمت فراہم کنندگان کے ارکان سرکاری ملازمین ہوں گے

30- تحفظ افسران اور خدمت فراہم کنندگان کے ارکان اس ایکٹ یا اس کے تحت بنائے گئے قواعد یا صادر کیے گئے احکام کی توضیعات کی اتباع میں عمل کرنے یا عمل کرنے کا ارادہ کرتے وقت مجموعہ تعزیرات بھارت کی دفعہ 21 کے معنوں میں سرکاری ملازمین تصور ہوں گے۔

مسئول الیہ کے ذریعے حکم تحفظ کی خلاف ورزی کے لیے سزا

31- (1) مسئول الیہ کے ذریعے حکم تحفظ یا عبوری حکم تحفظ کی خلاف ورزی اس ایکٹ کے تحت جرم ہوگا اور اس کے لیے ایک سال تک کی قید یا بیس ہزار روپے تک کا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

(2) ذیلی دفعہ (1) کے تحت جرم کی سماعت، جس حد تک ممکن العمل ہو، وہی مجسٹریٹ کرے گا جس نے ایسا حکم صادر کیا ہو جس کی خلاف ورزی مبینہ طور پر ملزم نے کی ہو۔

(3) ذیلی دفعہ (1) کے تحت الزامات مرتب کرتے وقت مجسٹریٹ مجموعہ تعزیرات بھارت کی دفعہ 498الف یا اس مجموعہ کی کسی دیگر توضیع یا ممانعت جہیز ایکٹ، 1961 کی توضیع، جیسی کہ صورت ہو، کے تحت بھی الزامات مرتب کرسکے گا۔ اگر حقائق سے انکشاف ہوتا ہو کہ ان توضیعات کے تحت کسی جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

اختیار سماعت اور ثبوت

32- (1) مجموعہ ضابطہ فوجداری 1973ء میں مندرج کسی امر کے باوجود دفعہ 31 کے ذیلی دفعہ (1) کے تحت جرم قابل دست اندازی پولس اور ناقابل ضمانت ہوگا۔

(2) صرف متاثرہ شخص کے تصدیقی بیان پر عدالت یہ نتیجہ اخذ کرسکے گی کہ ملزم نے دفعہ 31 کی ذیلی دفعہ (1) کے تحت جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

(خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

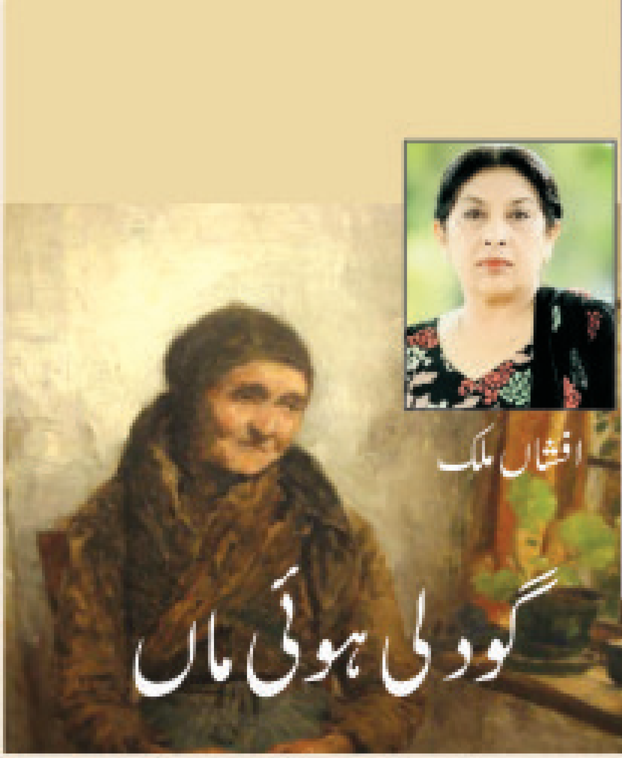

گودلی ہوئی ماں

افشاں ملک

ناصر دفتر سے لوٹا تو روزانہ کی طرح اماں عصر کی نماز سے فارغ ہو کر جائے نماز پر ہی بیٹھی تھیں- ہاتھ میں تھمی تسبیح کے ایک تواتر سے گرتے دانے، بند آنکھیں اور بآواز ہونٹوں کی جنبش بتا رہی تھی کہ کوئی ورد جاری ہے- شہلا اپنے کمرے میں اپنی کسی دلچسپی میں مگن تھی اور ملازمہ معمول کے مطابق باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی-

ناصر کی شادی کو ایک سال ہونے والا تھا لیکن اماں نے ابھی تک اس کی بیوی شہلا کو گھر کی ذمہ داریوں سے دور ہی رکھا تھا اور خود ملازمہ کے ساتھ مل کر خوش اسلوبی سے گھر چلا رہی تھیں۔ لیکن اب ناصر چاہتا تھا کہ شہلا گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھال لے- وہ اماں کو گھر کے کاموں میں مصروف دیکھتا تو بڑی محبت سے کہتا "اماں اب گھر کے کاموں کی ذمہ داری شہلا کو سونپ کر آزاد ہو جائیں، آرام کریں اور ہم دونوں سے اپنی خدمتیں کروائیں......!" ناصر کی اس محبت پر اماں کی آنکھیں بھر آتیں مگر وہ بڑے رسان سے اسے سمجھا دیتیں......

"بس بیٹا......ارے دو ابھی اسے آزاد کچھ دن، عمر پڑی ہے کام کرنے کے لیے۔۔۔! یہی کچھ دن ہوتے ہیں لڑکیوں کے جب وہ ذرا آزادی محسوس کرتی ہیں- بعد میں تو بچوں کی دیکھ بھال اور گھر گرہستی کے کاموں میں ہی گزر جاتی ہے ان کی ساری زندگی......اور پھر میری مدد کے لیے ملازمہ بھی تو ہے، سارے کام اچھی طرح کر لیتی ہے- بس ذرا نگرانی کی ضرورت ہے سو میں دیکھ لیتی ہوں......!!!"

ناصر نے اماں کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے گھر کے کاموں کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ بہت پہلے ہی رکھ لی تھی۔ بھلی اور ایماندار عورت لاولد تھی اور شوہر کے انتقال کے بعد اس کا کوئی گھر ٹھکانہ بھی نہ تھا- یوں اسے بھی مخلص لوگ اور ایک چھت میسر ہو گئی تھی۔ اماں اور ناصر اسے گھر کے فرد جیسا ہی سمجھتے تھے-

ناصر کی دلہن کے روپ میں شہلا اماں کو بہت اچھی لگتی تھی - وہ اس کی خوب ناز برداریاں کرتی تھیں، کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں، اسے سجا سنورا دیکھ کر خوش ہوتیں، پوچھ پوچھ کر اس کی پسند کے کھانے پکواتیں، دعاؤں سے نوازتیں اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوش دیکھ کر مطمئن ہو جاتیں۔ لیکن شہلا عجیب مزاج کی لڑکی تھی اسے نہ اماں پسند تھیں اور نہ ان کی محبت کے انداز بھاتے تھے۔ اسے صرف ناصر پسند تھا بلا شرکت غیرے۔

اماں کا دل چاہتا تھا کہ شہلا ان کے پاس بیٹھے، بات کرے لیکن شہلا ناصر کے دفتر جاتے ہی اپنے کمرے تک محدود ہو جاتی۔ گھر میں ہوتی تو ٹیلی ویژن کے ڈیلی سوپ اور فلمیں دیکھ کر وقت گزارتی یا پھر ناصر کے ساتھ باہر گھومنے جانا اسے پسند تھا- اماں کی قربت اسے گوارا نہ تھی- شروع کے دنوں میں اماں نے شہلا کی کم گوئی کو شرم پر محمول کیا لیکن رفتہ رفتہ اس کی بے نیازی انہیں محسوس ہونے لگی۔ جہاندیدہ تھیں، ایسے ہی رویوں کی ستائی ہوئی بھی تھیں سو خاموشی اختیار کر لی۔ ناصر سے بھی کچھ نہ کہا لیکن وہ شہلا کے اس رویے سے بے خبر نہ تھا اور خاموشی سے جائزہ لے رہا تھا- اس نے بھی محسوس کیا کہ شہلا کسی وقت نہ اماں کے پاس بیٹھتی ہے نہ ان سے مخاطب ہوتی ہے اور جب اماں خود اس سے مخاطب ہوتی ہیں تو لیے دیے انداز میں نپے تلے جواب دے کر خاموش ہو جاتی ہے......!

جب تک ناصر گھر میں رہتا اور اماں کے پاس بیٹھا ہوتا تو شہلا کو بھی ناصر کی وجہ سے بادل ناخواستہ اماں کے پاس بیٹھنا پڑتا لیکن اس کی کوشش یہی رہتی کہ ناصر بھی اماں سے دور رہے۔

گھر دفتر سے لوٹ کر ناصر کا اماں کے پاس بیٹھ کر کچھ وقت گزارنا روزانہ کا معمول تھا ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اماں اور شہلا روزانہ کچھ وقت ساتھ گزاریں باتیں کریں۔ شہلا جب تک آ کر نہ بیٹھتی وہ آوازیں دیتا رہتا- ناصر کے اصرار پر شہلا وہاں آ کر بیٹھ تو جاتی لیکن اس کے چہرے سے بیزاری صاف جھلکتی جو اماں کے ساتھ ہی ناصر کو بھی نظر آ جاتی - بلکہ اب تو ملازمہ بھی اماں کے تئیں شہلا کے اس رویہ کو سمجھنے لگی تھی۔۔۔!!!

ناصر کی فکر دن بدن بڑھتی جا رہی تھی وہ ہر حال میں اماں اور شہلا کے درمیان اچھے تعلقات کا متمنی تھا۔ ایک طرف شہلا اس کی بیوی تھی

جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا اور دوسری طرف اماں تھیں جن کا دل دکھانے کا خیال بھی اس کے لئے سوہان روح تھا۔ اماں سے تو اس کا رشتہ ہی بہت انوکھا تھا بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ان میں تو کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔۔۔ نہ وہ اس کی سگی ماں تھیں نہ سوتیلی، بلکہ وہ تو اس کی منہ بولی ماں تھیں اور پچھلے تین سال سے وہ ماں بیٹے ایک ساتھ رہ رہے تھے۔

اماں اور ناصر کے اس انوکھے رشتے کی کہانی بھی خوب تھی۔۔۔! ناصر صحافی تھا اور ایک مشہور ٹی۔وی چینل میں ریسرچ اور اسکرپٹ رائٹنگ کے شعبہ سے منسلک تھا۔ حالیہ پروجیکٹ کے تحت چینل کی طرف سے اسے ایسے سرکاری اور غیر سرکاری فلاحی اداروں کا سروے سونپا گیا تھا جو عمر رسیدہ، بیوہ اور بے سہارا خواتین کے تحفظ اور فلاح کے لیے کام کر رہے تھے۔ ''آشیانہ'' نام کے 'ایک غیر سرکاری اولڈ ایج ہوم' میں اس کی ملاقات صابرہ خاتون سے ہوئی تھی۔

سروے کے دوران بزرگ اور بے سہارا خواتین کے بہت سے مسائل اور تلخ سچائیاں سامنے آئیں۔ ناصر پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ خواتین جن کا دنیا میں کوئی نہیں تھا، بے سہارا اور عمر رسیدہ تھیں ان اداروں میں انہیں روٹی کپڑے اور ایک محفوظ چھت کے ساتھ ہی بیماری میں دوا علاج بھی اگر میسر تھا تو غنیمت تھا۔ زندگی کی ڈھلتی شام میں ان کے لئے اتنا بھی بہت تھا اور وہ اتنی سہولیات ملنے پر خوش اور مطمئن بھی تھیں۔ مگر ایسی بزرگ خواتین جو اپنوں کی بے اعتنائی کا شکار ہو کر یہاں پناہ گزین ہو گئی تھیں ذہنی طور پر زیادہ مایوس اور دکھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اپنوں کا انتظار جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ اور کئی کئی برس گزر جانے کے بعد بھی آس کی ڈور کو یقین سے تھامے وہ اپنوں کی راہ دیکھ رہی تھیں کہ شاید ان کے دل میں کبھی محبت کا دیا روشن ہو جائے اور وہ ان کو یہاں سے لے جائیں۔

صابرہ خاتون بھی ایک ایسی ہی ماں تھیں جو اپنے بیٹوں کی بے رخی کا شکار ہو کر اس ادارے میں آئی تھیں۔ تفصیلی بات چیت کے دوران انہوں نے ناصر کو بتایا تھا کہ ''ان کے دو بیٹے ہیں جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ میں مقیم آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ دو سال پہلے ان کے شوہر کا اچانک انتقال ہو گیا اور وہ اکیلی رہ گئیں۔ والد کے گزر جانے کے بعد بچوں نے مجھ سے رابطہ کیا تسلی بھی دی لیکن کاروباری مصروفیت کی بنا پر فوری آنے سے معذرت کرتے ہوئے جلد ہی مجھے اپنے پاس بلانے کا یقین دلایا۔ مگر دو سال کا عرصہ گزر جانے پر بھی نہ وہ آئے اور نہ ہی مجھے بلایا۔ شوہر کے گزر جانے کا صدمہ، بڑھتی عمر اور اکیلا پن مجھے اندر اندر کھائے جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں مجھے اپنے بچوں کی ضرورت تھی، میرا انتظار بڑھتا جا رہا تھا لیکن نہ وہ خود آ رہے تھے اور نہ مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ ہاں میرے دونوں بیٹوں کی باقاعدگی سے بھیجی گئی رقم سے میرا بینک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا اور ان کی بے اعتنائی اور بے رخی سے میرا دل خالی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ان کے پیسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری خوشی تو اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہنے میں تھی۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اپنا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر میرے پاس آ کر نہیں رہ سکتے لیکن میں تو ان کے پاس جا کر رہ سکتی تھی۔ نہ معلوم وہ خود مجھے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے تھے یا ان کی بیویوں کو میرا وہاں ان کے ساتھ رہنا گوارا نہیں تھا۔''

بولتے بولتے صابرہ بیگم کا گلا بھر آیا تھا مگر وہ خاموش نہیں ہوئیں شاید آج پہلی بار انہوں نے کسی سے اپنا درد بانٹا تھا۔۔۔!!!

''تنہائی اور خاموشی مجھے ڈرانے لگی تھی۔ میری دلچسپی کسی چیز میں نہیں بچی تھی۔ میرے گھر کا وہ باغیچہ جس میں میرے لگائے ہوئے بیلے اور موگرے کے پھولوں کی مہک سے فضا میں ہر وقت بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی رہتی تھی سوکھنے لگا تھا، دیسی گلاب کے وہ پودے بھی اب میری توجہ سے محروم ہو چلے تھے جن پر کھلنے والے پیازی رنگ کے گلاب کے پھولوں کی مہک سے میری روح تک معطر ہو جایا کرتی تھی۔ میرے بچوں کا بچپن، ان کی معصوم شرارتیں، اچھل کود اور ہنسی کی وہ آوازیں جو گھر کے ہر کونے میں محفوظ تھیں مجھے بے چین کرتی تھیں۔ اپنے ہی گھر میں ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح میں چکراتی پھرتی۔۔۔! تب گھبرا کر میں نے وہ گھر بیچ دیا اور ساری رقم اسی ادارے کو دے دی اور خود بھی یہیں آ گئی، کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا میرے پاس۔ میں نے سوچا میری جیسی اور بھی عورتیں ہوں گی سب مل کر ایک دوسرے کا درد بانٹ لیں گے۔ جب سے یہاں آئی ہوں تنہائی کا احساس کافی حد تک کم ہو گیا ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے دل میں درد اور آنکھوں میں بیٹوں کے انتظار کا موسم ٹھہر سا گیا ہے۔۔۔!!!

صابرہ خاتون کی آپ بیتی سن کر ناصر بہت اداس ہو گیا تھا۔۔۔!!! وہ خود بھی اس دنیا میں اکیلا تھا اور اکیلے پن کے درد کو بخوبی سمجھتا تھا، اس کی ماں اس کی پیدائش میں چل بسی تھی اور اس کا باپ جب وہ ایک سال کا تھا ایک حادثے کا شکار ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ بوڑھی دادی تھی جس نے تین سال کی عمر تک اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا لیکن ایک دن اچانک جب دادی بھی چل بسی تو محلے کا کوئی شخص از راہ ہمدردی اسے ایک یتیم خانے میں چھوڑ آیا جہاں اس کی پرورش ہوئی۔

ناصر ایک ذہین اور سلجھا ہوا بچہ تھا، اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے یتیم خانے کے مہتمم سرفراز علی نے ذاتی طور پر اس کی سرپرستی کی ذمہ داری

اپنے سر لے لی اور اس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ ناصر نے بھی ان کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ تعلیمی مراحل بخوبی طے کیے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے صحافت کو بطور کیریئر چنا۔ تین سال پرنٹ میڈیا میں کام کرنے کے بعد الیکٹرانک میڈیا کی طرف رخ کیا اور اس میدان میں بھی اپنی محنت اور لگن سے جلد ہی ایک مقام بنا لیا۔

صابرہ خاتون سے مل کر جب ناصر واپس لوٹا تو اپنے دل میں ایک مضبوط فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر ہی ''آشیانہ'' پہنچ کر صابرہ خاتون سے دوبارہ ملاقات کی اور نمناک آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں ان سے اپنی دلی تمنا کا اظہار کر دیا۔۔۔!!!

صابرہ خاتون کو اس وقت ناصر ایک معصوم بچہ نظر آیا۔۔۔ ایک لمحے کو انہیں لگا جیسے ایک اونچے پورے مرد کے اندر کا بچہ ماں کی ممتا پانے کے لئے بیقرار ہے۔۔۔!!! پیٹ کی اولاد نے تو آنکھیں پھیر لی تھیں لیکن دو ملتجی غیر آنکھیں ان کے چہرے پر جمی ہوئی ان سے ممتا کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ بس وہی ایک لمحہ زخمی ممتا پر جیسے مرہم کا ٹھنڈا پھاہا رکھ گیا اور صابرہ خاتون نے ناصر کی خواہش پر حامی بھر دی۔۔۔!!!

صابرہ خاتون کی حامی کے باوجود ناصر کو انہیں بحیثیت ماں اپنے گھر لانے کے لئے کئی قانونی مراحل سے گزرنا پڑا۔ ''آشیانہ'' کی مینیجنگ کمیٹی کا متفقہ فیصلہ تھا کہ صابرہ خاتون کے تحفظ اور فلاح کے پیش نظر ناصر کو اس سلسلے میں ایک حلف نامہ ادارے میں پیش کرنا ہوگا کہ اگر مستقبل میں اس کی طرف سے صابرہ خاتون کو کوئی شکایت ہوئی یا انہیں کوئی تکلیف پہنچی تو ادارہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا مجاز ہوگا۔

ناصر نے بخوشی حلف نامہ داخل کیا اور صابرہ خاتون کو "آشیانہ" سے بطور ماں اپنے گھر لے آیا۔ دونوں کے بیچ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک خوبصورت اور مضبوط رشتہ بن گیا۔ ان کو ناصر کے ساتھ رہتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ ناصر کی عمر کو دیکھتے ہوئے اب وہ اس کی شادی کر کے ایک ماں کا فرض ادا کرنا چاہتی تھیں۔ تبھی ایک دن جب ناصر بہت اچھے موڈ میں ان کے پاس بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا تب انہوں نے اس کی شادی کی بات چھیڑ دی۔۔۔

''بیٹا میں چاہتی ہوں تمہاری شادی ہو جائے۔۔۔ گھر بس جائے تمہارا۔''

''گھر تو بس گیا ہے اماں۔۔۔!'' وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔۔۔

''آپ کے آجانے سے'' وہ شرارت پر آمادہ تھا

''بیوقوف لڑکے میں تیری شادی کی بات کر رہی ہوں'' ناصر کی بات سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں

''دیر سے شادی ٹھیک نہیں بچے اگر تم نے کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہو تو بتا دو ورنہ میں کچھ کرتی ہوں''

''ارے نہیں نہیں اماں! میں نے کوئی لڑکی وڑکی پسند نہیں کر رکھی ہے بس آپ کو پسند کیا تھا اور لے آیا'' وہ بدستور مذاق کے موڈ میں تھا اور ہنس رہا تھا لیکن صابرہ خاتون کو سنجیدہ دیکھ کر بول اٹھا۔۔۔

''اچھا! اچھا! جیسی آپ کی مرضی لیکن میری ایک شرط ہے کہ شادی آپ کی پسند سے ہوگی اور آپ کو حق ہے جس پر چاہیں قربان کر دیں مجھے۔۔۔ اف بھی نہ کروں گا''

وہ چھیڑنے سے باز نہیں آ رہا تھا انہیں۔ اس کی رضامندی مل جانے پر صابرہ خاتون نے سرفراز علی کی بیوی کی مدد سے دو ایک لڑکیاں دیکھیں اور شہلا کو پسند کر کے بہو بنا لائیں۔۔۔!!!

ناصر کی زندگی میں شہلا بہار بن کر چھا گئی۔ خلوتیں آباد ہوئیں تو زندگی اس کے سامنے ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ دل میں مسرت اور شادمانی کے موسم اتر آئے، بشاشت اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ اس کی زندگی میں اب خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

کچھ ہی وقت اچھا گزرا کہ رفتہ رفتہ صابرہ خاتون کے تئیں شہلا کا رویہ بدلنے لگا۔ اس کی نظروں میں اماں کے لیے نہ احترام تھا نہ محبت۔۔۔ ناصر کو اس کے اس رویے سے تشویش ہونے لگی وہ دل ہی دل میں عجیب سی شرمندگی سے دوچار رہتا۔ وہ تو تصور میں بھی اماں کو دکھ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ زندگی میں ان کے آجانے سے اس نے ماں کی ممتا کو محسوس کیا تھا اور ایک ایسا رشتہ جیا تھا جس کا مزہ اس نے چکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے اتنے بڑے خلاء کو صابرہ خاتون نے اپنی بے لوث محبت سے پر کیا تھا۔ وہ تھجین ہو اٹھا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شہلا سے کھل کر بات کرے گا اور اسے سمجھائے گا۔۔۔ اماں سے اپنے رشتے کی نوعیت بتائے گا اور اسے یقین تھا کہ شہلا احساس دلانے پر اپنے رویے پر ضرور غور کرے گی۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی ناصر نے اس سے کھل کر بات کی تو وہ بھی کھل کر سامنے آ گئی دل میں صابرہ خاتون کو لے کر جو غبار بھرا ہوا تھا ایک جھٹکے میں نکال باہر کیا۔۔۔

''ناصر اچھا ہوا تم نے ہی بات چھیڑ دی۔۔۔ میں خود تم سے بات کرنے والی تھی۔''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔ کیوں نہیں !! اگر اماں سے تمہیں کوئی شکایت ہو تو مجھے بتاؤ۔۔۔! وہ تو تم سے اور مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں سارا گھر سنبھال رکھا ہے انہوں نے۔۔۔!!! پوری طرح آزاد ہو تم!!! وہ اسے احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور شہلا تو جیسے ناصر کی کوئی بات سن ہی نہیں رہی تھی اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔

''ناصر حیرت ہوتی ہے مجھے تمہاری حرکتیں دیکھ کر۔۔۔! تمہارا سارا دھیان صرف لقماں کی خوشی میں ہی رہتا ہے۔۔۔ چہرہ پڑھتے رہتے ہو تم ان کا۔۔۔ میں تو تمہیں نظر ہی نہیں آتی۔۔۔! لوگ سگی ماؤں کی اتنی پرواہ نہیں کرتے جتنی تم اس غیر عورت کی کرتے ہو۔ کوئی بچے تو تھے نہیں تم کہ تمہیں ماں کی اتنی ضرورت تھی کہ اپنی ماں نہیں تھی تو اولڈ ایج ہوم سے ہی ماں کے نام پہ اٹھا لائے ایک عورت۔۔۔''

وہ ایسا زہر اگلے گی ناصر کو اندازہ بھی نہیں تھا۔۔۔! گنگ سا بیٹھا وہ اسے دیکھ رہا تھا مگر شہلا کے ترکش میں ابھی کچھ تیر باقی تھے۔۔۔

''تنگ آ گئی ہوں میں ان کی دخل اندازی سے۔۔۔ ہر وقت نصیحتیں۔۔۔ ناصر کو یہ پسند ہے وہ پسند نہیں ہے۔۔۔ اس کی پسند کی ایک ڈش بنا لیا کرو اپنے ہاتھ سے۔۔۔ ناصر لاابالی سا ہے۔۔۔ اس کی بکھری چیزیں سمیٹ کر رکھ دیا کرو۔۔۔! اس کی الماری ٹھیک کر دیا کرو۔۔۔! حد ہو گئی ہے۔۔۔!!!'' وہ بولے جا رہی تھی۔۔۔

''وہ ہوتی کون ہیں مجھ پر اس طرح حکم چلانے والی بس ایک منہ بولا رشتہ ہی تو ہے تمہارے اور ان کے درمیان۔۔۔ اور سنو! وہ جس طرح تمہارے اوپر حکم چلاتی ہیں مجھے وہ بھی پسند نہیں ہے۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ حد پار کر رہی ہیں وہ۔۔۔''

''خاموش ہو جاؤ۔۔۔! ایک لفظ بھی آگے مت بولنا'' ناصر چیخ پڑا۔۔۔!

''کتنی بے حس ہو تم۔۔۔! جذبات سے عاری۔۔۔! اور کیسی تعلیم حاصل کی ہے تم نے کہ ذرا تمیز نہیں ہے تمہیں بات کرنے کی۔۔۔! ادب لحاظ سب طاق پر رکھ دیا۔۔۔! کبھی سوچا تم نے کہ تمہارا یہ رویہ کتنا دکھ دیتا ہوگا انہیں؟'' ایک درد سا اس کے اندر اتر آیا۔۔۔!!!

لیکن شہلا کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی اسے تو جیسے اپنے اور ناصر کے درمیان صابرہ خاتون کا وجود برداشت ہی نہیں تھا۔ دونوں کے بیچ سرد جنگ سی شروع ہو گئی، آپس میں بات چیت بھی کم ہو گئی، دونوں کھنچے کھنچے سے رہنے لگے۔ کئی دن یوں ہی گزر گئے۔۔۔!!!

لقماں کی وجہ سے ناصر بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا، سو اس نے خود ہی شہلا سے بات کرنے کی پہل کر دی۔۔۔ شہلا بھی شاید انتظار میں ہی تھی سو اس نے بھی زیادہ نخرے نہیں دکھائے۔ ماحول میں کچھ اچھی سی تبدیلی ہوئی تو ناصر کو بھی سکون کا احساس ہوا اور حالات کے بہتر ہونے کی آس بھی بندھ گئی۔

اس دن جب ناصر دفتر سے لوٹا تو خلاف معمول شہلا کو اچھے موڈ میں دیکھ کر اسے اطمینان سا ہوا۔ سوچنے لگا کہ شاید شہلا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں پہونچا تو شہلا کو منتظر بھی پایا۔ ادھر کافی دنوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ جب وہ بیڈ روم میں آتا تو شہلا اسے سوئی ہوئی ملتی۔۔۔ نہ معلوم سو جاتی تھی یا سو جانے کا ناٹک کرتی تھی۔۔۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو گیا......!

''کیا بات ہے بھئی آج تو تم جاگ رہی ہو۔۔۔ کیا ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔۔۔؟'' اس نے مسکراتے ہوئے شریر انداز میں شہلا کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی!!!

''ہاں ناصر! میں کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ تم سے بات کروں لیکن تم ناراض تھے تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی'' بڑی ادا سے اس نے ناصر کی طرف دیکھا۔۔۔

''ہاں تھا تو ناراض۔۔۔! !! تم منا لیتیں۔۔۔!!! میں تو منتظر تھا۔۔۔!!! خیر کوئی بات نہیں میں منا لیتا ہوں تمہیں۔۔۔!!! اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' وہ ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔

''ناصر غلطی میری بھی ہے اتنے دنوں میں بھی تم سے دور دور رہی۔۔۔'' شہلا کی اس تبدیلی پر ناصر کو حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی۔ وہ اسے اب اور شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا صرف یہی تو چاہتا تھا کہ شہلا ماں سے اس کے رشتے کی نوعیت کو سمجھ لے ان کی عزت کرے ان سے محبت کرے بس۔۔!!!

''ہاں تم کیا کہنا چاہ رہی تھیں کہو نہ۔۔۔ مجھ سے دل کی بات بتانے میں اتنی شرم......؟'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔۔۔

ایک قاتل ادا سے شہلا نے ناصر کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔

''ناصر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم لقماں کو واپس' آشیانہ '' پہنچا دو۔۔۔!!!''

Dr Afshan Malik
S-4 , Azim Estate 2
New Sir Syed Nagar
Medical Road, Aligarh-202002 (U.P)
Mob : 09557654926

شہر بانو

کہانی

جستجوئے زندگی

قدرت نے موہن کے ساتھ شکل وصورت کے معاملہ میں بہت زیادہ فیاضی برتی تھی؟ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک وسیع حلقہ میں غیر مناسب طور پر چھپی ہوئی تھیں۔ ناک غیر معمولی طور پر اونچی اور چھوٹی تھی۔ چہرہ کی ساخت وسیع اور ہونٹ بہت موٹے اور لمبے تھے۔ مجموعی طور پر اس کی شکل ایسی تھی کہ ہنسی روکنے میں بہت ضبط اور تامل کرنا پڑتا تھا۔ اس کی شکل گویا نمونہ تھی اس بت کی جو کسی نومشق نے ابتدا میں تراشا ہو۔ خدا نے اسے دوسروں کے رنج وکلفت کو بھلانے کے لیے دنیا میں بھیجا تھا۔ اس کی شکل پر باوجود کوشش کے بھی رنج وغم کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ سڑک پر بے ساختہ لوگوں کی نظر اس طرف اٹھتی اور لوگ ہنس دیتے تھے۔ موہن دوسروں کو ہنساتا لیکن خود کبھی نہیں ہنستا۔ اس کے چہرے پر ہنسی کے آثار ہمیشہ ہی تازہ رہتے لیکن دل میں اس کا اثر خواہ اس کے دل میں رنج والم کا طوفان برپا ہو لیکن راہ چلنے والوں کو وہاں مضحکہ کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کوئی شخص اس کی طرف دوبارہ دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا اور عورتیں تو اس کی شکل کی طرف نظر اٹھا کر خفیف ہو جاتیں۔ لیکن اس کی شکل کے تمسخرانہ انداز کے پس پردہ ایک روح پوشیدہ تھی اور اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جوان کے لیے ضروری ہیں اس کا سن 25 کے قریب تھا۔

موہن نے بسنتی کو موت کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ بسنتی کا حسن اپنی آپ نظیر تھا۔ اس کے بال شب نالہ سے زیادہ سیاہ تھے۔ بدن چھریرا اور قد میانہ تھا اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک تھی لیکن وہ نور سے محروم تھیں اس کا چہرہ ہمیشہ ایک آسمانی نور سے چمکتا رہتا تھا لیکن اس پر مفلسی کے آثار بھی پائے جاتے تھے اس کی غزالی آنکھیں گو روشنی سے محروم تھیں لیکن دوسروں کو ان میں ایک غیر معمولی تڑپ دکھائی دیتی تھی اس دائمی تاریکی میں جو قسمت نے اس کے لیے مقرر کر رکھا تھا وہ ستارہ کی طرح تاباں رہتی بسنتی ابھی پورے سولہ برس کی بھی نہ تھی وہ خود اپنی حالت سے ناواقف تھی۔ موہن پر بدصورتی کی تاریکی مسلط تھی تو بسنتی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا عام انسانوں کی زندگی کے لیے ایک بعید الفہم مضمون تھی۔ بسنتی کے سر پر کسی کا سایہ نہ تھا اور موہن بھی خاندان کی مسرتوں سے ناآشنا تھا۔ بسنتی کی تنہائی قبر کی تنہائی تھی جہاں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ موہن کی تنہائی اس آوارہ روح کی تھی جو سب کو دیکھتی ہے لیکن خود اکیلی ہے۔ بسنتی بینائی سے محروم تھی تو موہن زندگی کی نعمتوں سے دونوں امید اور تمنا کی حدود سے باہر تھے۔ ان دونوں کی حالت پر غور کرنے کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ انسان خود اپنی مسرتوں سے تھوڑی دیر کے لیے محروم ہو جائے۔ ان کی زندگی میں کتنی ناکامیاں پوشیدہ تھیں۔ قسمت نے دو معصوم زندہ ہستیوں کی زندگی خاک میں ملانے کے لیے اس سے اہم سازش کبھی نہ کی ہوگی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات میں نہ تلخیاں سرے سے موجود تھیں اور بہشت اگر دنیا میں میسر ہو سکتی ہے تو وہ اس نعمت سے بہرہ اندوز تھے۔ بسنتی موہن سے محبت کرتی تھی اور موہن بسنتی سے موہن بسنتی کی پرستش کرتا تھا اور بسنتی موہن کو دیوتا سمجھتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی موہن تم کتنے خوبصورت انسان ہو (کیا قسمت کا یہ مضحکہ نہ تھا) اس ابدی تاریکی میں بھی وہ جان بچانے والے کی محبت اور اس کے دل کی شرافت کو دیکھ سکتی تھی۔ لیکن خلقت اپنی ہزاروں آنکھوں کے باوجود اس حقیقت کو نہ دیکھ سکتی تھی اس کے پاس وہ آنکھیں کہاں تھیں جو اس کے دیوتا کی روح کی گہرائیوں کو دیکھ سکتی۔

موہن ساری دنیا پر نظر ڈالتا لیکن بسنتی کے سوا اس کو دوسری کوئی چیز

نہ دکھائی دیتی۔ انسانوں کے اس عظیم الشان سمندر میں اسے انسانیت کی کشتی سوائے بسنتی کے اور کہیں نظر نہ آتی تھی جس پر اس کی طوفان زدہ روح کو پناہ مل سکے۔ اس کے لیے بسنتی ایک آسمانی فرشتہ تھی۔ ان دونوں کی دنیا میں سوائے موہن اور بسنتی کے کسی دوسرے کی ذات نظر نہیں آتی اور انسانوں کے دل بادل محض وہمی اور فرضی تھے۔ بسنتی کے دل میں اگر کوئی خیال ہوتا یہ کہ بغیر میرے موہن کی زندگی کیسی ہوتی۔ موہن کا دل بھی اسی خیال سے معمور تھا۔ رات کو نیند کی خوشگوار گہرائیوں میں ایک دوسرے کی تصویر فرشتہ رحمت کی طرح ان پر نازل ہوتی تھی۔

ایک خدا رسیدہ بزرگ جس طرح تسبیح کے دانوں کو حرکت دیتا ہے اسی طرح ان کی زندگی کے دن گزرتے جاتے تھے۔ ایک شب جب کہ موہن اور بسنتی شب ماہ کی نورانی شعاعوں سے نہارہے تھے بوڑھی خالہ نے جو موہن کے گھر کا انتظام کرتی تھی۔ دبی ہوئی آواز میں کہا کہ ”کیا اچھا ہوتا کہ ان دونوں کا بیاہ ہو جاتا“ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ موہن نے نظر اٹھا کر خالہ کی طرف دیکھا اور پھر سوچنے لگا بیاہ! اس لفظ کے معنی پر غور کرنے کی تکلیف موہن نے پہلی دفعہ کی اور وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ایک جان دو قالب تو اسی وقت سے ہو چکے تھے جبکہ موہن نے بسنتی کو بخار اور فاقہ کی تکلیف سے نجات دلائی تھی اور ساری دنیا نے بسنتی کی بیکسی سے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن کیا اس کے لیے کسی رسمی بیاہ کی ضرورت ہے! بسنتی بھی خالہ کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکی لیکن اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی روشنی رقص کر رہی تھی اور آنکھوں میں ایک نور تھا۔ اس نے بھی سوچا کہ کیا بیاہ سے اس کی موجودہ خوشی میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا میں وہ بہشت کا لطف نہیں اٹھا رہی۔

اسی مہینے میں موہن اور بسنتی رسمی طور پر ایک دوسرے سے مربوط کر دیے گئے! جس طرح خالص آکسیجن میں سانس لینا ممکن نہیں ہے اسی طرح معصومانہ محبت اور شرافت بھی انسانی دل کے لیے تسکین بخش نہیں ہو سکتی۔ ہم لوگ خلوص اور محبت کو عظمت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن انسان کے خطاوار دل کی تسکین اس سے اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں دوسرے غیر لطیف اجزا کی آمیزش ہو۔

وقت گزرتا گیا اور موہن اپنے دل میں دن بدن ایک خلش محسوس کرنے لگا۔ وہ اپنی اس حالت پر نادم تھا اور اکثر نفس کو برا بھلا کہتا لیکن روز و شب کے اکثر بیکار لمحوں میں یہ خلش بہت زیادہ ہو جاتی اور جوش اس قدر بڑھتا کہ وہ اپنے نفس کے سامنے مجبور و لاچار ہو جاتا ایسے موقعوں پر اس کی صورت خوفناک ہو جاتی یہ خلش اس لیے نہ ہوتی کہ بسنتی کی محبت میں کوئی کمی نظر آتی بلکہ اس کے لیے اس کی معصومانہ محبت اور شرافت موہن کے انسانی دل کی تسکین کا باعث نہ ہو سکتی تھی۔ بسنتی کی پرستش کی جا سکتی تھی جس طرح یونانی دیویوں کی پرستش ہوتی ہے لیکن اس سے محبت نہیں کی جا سکتی تھی۔ بسنتی ان خیالات کے ہجوم سے پاک تھی اس کے دل میں اسی سمندر کی سطح آب کی طرح سکون تھا جس نے طوفان کے تلاطم سے نجات پائی ہو۔ موہن اب بسنتی کے پاس جانے سے ڈرتا۔ اس کی کمزور فطرت بسنتی کی طرف نگاہ اٹھانے میں بھی خوف کھاتی۔ بسنتی دیوی تھی جس کی طرف خطاکار انسان کی نظر نہیں اٹھ سکتی ہے۔ موہن کی زندگی ان خیالات کی وجہ سے بے مزہ ہو گئی تھی۔ زندگی کے بیکار لمحوں میں خیال اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی کی تصویر پیش کرتا جس کے لب لعلیں مہر محبت کے ثبت ہونے کے لیے بے چین ہو رہے ہوں جس کی آنکھوں میں محبت کا نشہ جھلک رہا ہو اور جس کا دل بھی انہی جذبات سے معمور ہو جو موہن کے دل کو چین لینے نہ دیتے۔ بالآخر اس کی زندگی میں انقلاب ہوا۔ وہ موہن جو اپنی بدقسمتی کی وجہ سے سڑک پر جانے سے ہمیشہ اجتناب کرتا تاکہ لوگوں کے تمسخر سے محفوظ رہ سکے اب ہر وقت گھر سے باہر رہتا اور بڑی رات گئے گھر آتا۔ شام کے وقت وہ اکثر ان اطراف میں ٹہلتا پھرتا جہاں محبت کی جنس کی علانیہ بکری ہوتی ہے اور جہاں نفس کی غلطیوں پر کوئی حجاب ڈالنے کی بھی کوشش گوارا نہیں کی جاتی۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا اور بسنتی کا صاف و شفاف دل اس کی قسمت کے اس انقلاب سے بالکل بے خبر رہا اس میں کسی قسم کی تاریکی کا شائبہ بھی نہ تھا۔

موہن ایک دن شام کے وقت جو گھر سے گیا تو رات کو بھی واپس نہ آیا۔ صبح کو بھی باوجود انتظار کے نہ آیا۔ رات آئی اور گزر گئی لیکن موہن کا کہیں پتہ نہ چلا۔ بسنتی نے دونوں راتیں بیٹھ کر گزار دیں اور ایک دانہ اس کے منہ میں نہ گیا کیونکہ بغیر موہن کے وہ کبھی کھانا نہ کھاتی۔ بصارت سے محروم بسنتی مجبور تھی وہ جستجو سے باہر نہ جا سکتی تھی لیکن اس کی روح موہن کے لیے بے چین تھی۔ اس کی زندگی میں انقلاب ہو چکا تھا۔ اس کی حسرتیں غائب ہو چکی تھیں دوسرے روز شام کو بسنتی کے کانوں نے اس کی قسمت کا فیصلہ بھی سن لیا۔ موہن کو کسی رئیس کی تعظیم نہ کرنے پر دس سال قید سخت کی سزا ہو گئی تھی۔ روپیہ دنیا میں کیا نہیں کر سکتا۔ پولیس نے بھی رئیس کی حمایت میں موہن کو چند سنگین جرائم کا مرتکب قرار دے کر اسے پھر راہ چلنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر دیا۔ بسنتی کے رنج و الم کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کا دل اسی وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن کسی نے اس کی آنکھوں میں آنسو کی ایک بوند بھی نہ دیکھی۔ مگر ان میں وہ روشنی نہ تھی بلکہ حلقہ پڑ گیا تھا۔

بسنتی نے بہت جلد اپنی مصیبت کو پس پشت ڈال دیا اور موہن کی خدمت کے لیے تیار ہو گئی اس نے سوچا کہ اس پر فرض ہے کہ ظاہری رنج والم سے بے نیاز ہو کر موہن کو آزاد کرانے کی تدبیر کرے اور وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو گئی جو ایک عورت کر سکتی ہے۔ خواہ اس میں اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے کیونکہ وہ جان تھی تو موہن ہی کے لیے تھی۔ ہر روز صبح کو وہ قید خانہ کی طرف چلی جاتی اور شام کو تھک کر واپس آ جاتی روزانہ وہ یہ کوشش کرتی کہ قید خانہ کی کھڑکیوں کے نزدیک وہ جا کر کھڑی ہو سکے اور اپنی صورت موہن کو دکھا سکے۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہونا تھی نہ ہوئی راہ چلنے والے اس کے پاس سے گزر جاتے اور بجائے اس کے کہ اس سے ہمدردی کریں وہ اس کی بیکسی کا مضحکہ اڑاتے لیکن اس سے بسنتی کے ثبات قدم میں کوئی فرق نہیں آتا اس کی دنیا میں موہن کے سوا کسی دوسرے کے لیے جگہ نہ تھی۔ سات مہینے کی لگاتار کوشش کے بعد بھی کامیابی اس سے اتنی دور تھی جتنا قطب جنوبی قطب شمالی سے دور ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور ایک دن وہ بھی آ گیا جبکہ وہ بستر پر پڑی بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملوں میں بھی کچھ معنی پوشیدہ تھے۔ وہ موت کی آرزومند تھی تاکہ درگاہ الٰہی میں حاضر ہو کر موہن کی آزادی کے لیے دعا کرے۔

ایک روز شب کو جبکہ ساری دنیا سو رہی تھی اور انجمہائے فلک اپنی شبانہ رفتار میں مشغول تھے بسنتی کے کانوں میں دروازے پر دستک دینے کی آواز آئی وہ کمزوری کی حالت میں بدحواس پڑی ہوئی تھی اور شب کے سناٹے میں اسے کمزور آواز سنائی دے رہی تھی دستک دینے والے نے بمشکل یہ الفاظ سنے جو نہایت کمزور آواز میں ملفوف تھے 'میں زندگی میں اپنا فرض ادا نہیں کر سکی لیکن مرنے کے بعد ضرور ادا کر سکوں گی'۔ بسنتی اس دنیا کو چھوڑ رہی تھی۔ بوڑھی خالہ نے دروازہ کھولا۔ موہن دروازے پر کھڑا تھا۔ کیا اس کی آنکھیں خطا تو نہیں کر رہی تھیں۔ موہن تحقیقات کے بعد بے قصور ثابت ہوا تھا اور وہ قید سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ دوسرے لمحہ میں موہن بسنتی کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ پلنگ کے پاس دوزانو ہو گیا 'میری روح گناہوں کے بارے دبی ہوئی ہے'۔ موہن اپنے دل کے بار کو ہلکا کرنا چاہتا تھا لیکن بسنتی نے اس کی بات کاٹ کر کہا 'موہن تم آ گئے' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی 'رخصت میرے پیارے رخصت اب ہم لوگ دوسری دنیا میں ملیں گے' یہ کہہ کر لیٹ گئی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ آنکھوں میں پھر اگلی سی چمک آ گئی اور چہرہ پر وہی نورانیت اور معصومیت رقص کر رہی تھی آنکھ کی پلکوں پر آنسو کا ایک قطرہ چھلک رہا تھا کیا یہ مسرت کا آنسو تھا ستارے اپنی رفتار میں اسی طرح مشغول تھے سارا عالم سائیں سائیں کر رہا تھا کہیں سے جوگی کی تان کی غم انگیز صدا آ رہی تھی 'سنتو مایا جگت بھولا نا' موہن کمرے کی دھیمی روشنی میں بیٹھا ہوا تھا دنیا اس کی آنکھوں میں بے لطف اور سنسان نظر آ رہی تھی وہ زندگی کی مسرتوں کی تلاش میں بسنتی کو بھول کر موت کا آرزومند تھا۔ (بشکریہ ماہنامہ عصمت، ستمبر 1933)

فرہنگ آصفیہ سے

برات عاشقاں برشاخ آہو۔ ف۔ ضرب المثل ( ) یہ فارسی زبان کی ضرب المثل ہے۔ جو وہاں تین طرح سے بولی جاتی ہے۔ اول طرح تو یہی ہے جو اوپر لکھی گئی۔ دوسری۔ تیسری حسب ذیل ہے۔ یعنی برات بریخ و برات بسوئے یخ۔ اسے عدم وثوق۔ بے ثباتی۔ ناامیدی۔ نامرادی لاحاصل و بے سود کے موقع پر بولتے ہیں

بنوع خوشدلی رہ کردہ از عالم کہ پنداری
بط مینا نے برشاخ آہو آشیاں دارد (تاثیر)

( ) جھوٹ بولنے اور جھوٹا وعدہ کرنے پر بھی وہاں اسکا اطلاق ہوتا ہے

(چونکہ ہرن ایک چنچل۔ اچپل بے چین۔ مضطرب المزاج اور نچلا نہ رہنے والا جانور ہے۔ جس سے اسکے سینگ پر بھی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ اس وجہ سے عدم حصول مراد اور وعدہ دروغ کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ عدم استقلال و عدم استحکام سے بھی مراد لی جاتی ہے چنانچہ استاد ذوق نے بھی اس مثل کو اردو شعر میں باندھا ہے اور اثنائے گفتگو میں بھی بطریق تمثیل یہ کہاوت زبان پر آجاتی ہے حضرت ذوق کا شعر ہے

سوال بوسہ کو ٹالا جواب چین ابرو سے
برات عاشقاں بر شاخ آہو اس کو کہتے ہیں (ذوق)

یعنی ہم نے جو اپنے محبوب سے بوسہ کا سوال کیا تو اس نے تیوری چڑھا کر اور چیں بجبیں ہو کر ظاہر کر دیا کہ تمہاری یہ مراد بر آنے والی نہیں ہے ہم سے ایسی توقع نہ رکھئے۔ پس شاعر یہ کہتا ہے کہ ہمارے حق میں یہ جواب ایسا ملا کہ جسے ''برات عاشقاں برشاخ آہو'' پر محمول کر سکتے ہیں گویا ہماری یہ درخواست لاحاصل بے سود اور فضول ٹھہری۔

تبسم زیرلب

شفیقہ فرحت

یہ ہنسنا ہنسانا ہی تو ہے جو انسان کو جانور کی صف سے اٹھا کر ایک سیڑھی اوپر کھڑا کر دیتا ہے۔ ورنہ...

ارے صاحب مروت تکلف کیا ــــ ؟ خدا لگتی کہیے۔ ورنہ کوئی خاص فرق محسوس کرتے ہیں آپ دونوں میں ــــ ؟ ہماری عقل ناقص اور دیدۂ بیم بینا میں تو ہے نہیں۔

روتے دونوں ہیں۔ با آواز بے آواز۔ ہاتھی جیسے ڈیل ڈول والے جانور کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھے نہیں جاتے گھوڑے، بیل اور کتے کی بات تو چھوڑیے۔ روتا تو بیچارہ گدھا بھی ہوگا۔ لیکن اس کے اور اس جیسوں کے رونے پر سب کو ہنسی آتی ہے۔

خیر۔ رونے سے ہم ہنسنے پہ آجائیں۔ لگانے والے خوب کھل کر قہقہے لگاتے ہیں۔ ایسے کہ چھتیں اڑ جائیں، چار گھروں کی نیند اڑ جائیں۔ یہ قہقہے نشے بے نشے ہر حالت میں لگتے ہیں۔ شرافت کے دائرے میں رہ کر اور ہر دائرے سے آزاد بے نیاز خباثت کے اظہار کے طور پر۔ اس کے لیے کسی سوجھ بوجھ عقل و شعور کی ضرورت نہیں۔

لیکن تبسم زیرلب انمول دولت بھی ہے اور مشکل فن بھی۔ بے ساختہ ہے اور ساختہ بھی۔ قدرت کی دین ہے، فطرت کی معصومیت کی دلیل ہے۔

چند دنوں کا ننھا بچہ بھی مسکراتا ہے۔ اور روئے زمین کی لافانی حسینہ میڈونا بھی۔

پتہ نہیں مائیکل انجلو کو کس الہامی گھڑی میں یہ ہلکی سی مسکراہٹ مل گئی۔ تبسم زیرلب کی دولت ہاتھ آگئی اور اس نے ایک سادہ سے چہرے پر چپکا دی اور وہ چہرہ شاہکار بن گیا۔ ایسا شاہکار کہ صدیاں گزر گئیں لیکن حسن کی دنیا کی اس خاتون اول، اس بیوٹی کوئین کی جگہ کوئی نہ لے سکی۔

تو صاحب معصوم یہ بنائے، حسین یہ بنائے اور بے وقوف یہ بنائے۔ مسکرانے والے کو بھی اور اس مسکراہٹ کے دیکھنے والے کو بھی۔ اس کی سادگی میں پرکاری ہے اور بے خودی میں ہوشیاری۔ پھر تو ہوا نا یہ وہ فن جو بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تلوار کی دھار پر چل کر اور سوئی کے ناکے سے نکل کر۔ !

تبسم زیرلب کے حسن و معصومیت کے جلوے تو دیکھ لیے۔ اب ذرا اس کی حماقتوں کے نظارے ہو جائیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو عقل سے پیدل ہوتے ہیں، کسی قسم کا شعور اور ہوش نہیں رکھتے، وہ بھی دل سادہ کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ رکھتے ہیں۔ اچھا سلوک کیجیے یا برا، ماتھے پر شکن تو کبھی آئے گی نہیں اور ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہ ہوگی۔ شاید اسی کے سہارے وہ زندہ رہتے ہیں اور زندوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اس مسکراہٹ کو نہ جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں۔

اللہ کے ایسے نیک بندے بھی ہیں جو آسمانی سلطانی ہر دکھ جھیل لیتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔

کچھ دن پہلے ایک صاحب تشریف لائے۔ حلیے سے ویران اور چہرے سے پریشان تو لگ رہے تھے۔ مگر ہونٹوں کے کسی کونے پر مسکراہٹ بھی جیسے گوند سے چپکی ہوئی تھی۔ حالات و معاملات کچھ سمجھ میں نہیں آئے۔ بڑی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولے تو ہم نے پوچھا۔

"کہیے سب خیریت ہے ــــ ؟

فرمایا ــــ "جی وہ رات میں چھوٹی بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ بس

بھی خبر دینے آیا تھا — "

جی میں آیا کہہ دیں —— "آپ انتقال کی خبر سنا رہے ہیں یا پہلی ولادت کا مژدہ سنا رہے ہیں"۔

خیر یہ تو ان کا غم تھا۔ اسے تو انھیں کو سنبھالنا سمیٹنا تھا۔ چاہے تبسم کی گٹھری میں باندھیں چاہے آہوں کے پردے میں لپیٹیں۔ ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ جب کہیں تعزیت کے لیے جاتے ہیں یا کسی حادثے پہ اظہار ہمدردی کرتے ہیں تو خون خرابے تک کی نوبت آجاتی ہے۔

شہر کے کسی بڑے آدمی کے بیٹے کا انتقال کسی حادثے میں ہوگیا، ہمدردی جتانے اور غم بٹانے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ "صاحب مسکراہٹ" بھی چوتھے پانچویں دن وہاں پہنچے۔ لہجے میں غم اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا:

"صاحب زادے کی انتقال کی خبر سن کر بڑا افسوس ہوا۔ جوان اولاد کا صدمہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ میں حادثے کے دن شہر میں تھا نہیں ورنہ اسی وقت حاضر ہوتا"۔

وہ صاحب انھیں اچھی طرح جانتے بھی نہ تھے۔ مگر ہمدردی کرنے آئے تھے۔ سر اٹھا کر انھیں غور سے دیکھا۔ وہ عادتاً مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ نظر آگئی۔ عادت فطرت کیسے سمجھتے۔ ایک دم بھڑک اٹھے:

"اچھا ہوا آپ اُس وقت نہ آئے ورنہ ایک کے بجائے دو جنازے اٹھتے — "

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں"۔ پُرسہ دینے والے نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"جی —— یہ جو آپ مسکرا مسکرا کر مجھے میرے بیٹے کا پُرسہ دے رہے ہیں۔ تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ آپ اُس کی موت اور میرے غم پر بہت خوش ہیں۔ اسی مسرت کا اظہار اگر اُس دن کیا ہوتا تو کیا میں آپ کو زندہ چھوڑ دیتا"۔

وہ غریب معمولی انسان۔ ڈر سے کانپنے لگا۔

"میں اس حادثے پر خوش ہوں گا؟ حضور آپ میرے بزرگ ہیں آپ کا غم میرا غم ہے۔ خوش ہونے کا سوال کیا۔ میرا کلیجہ تو صدمے سے پھٹا جا رہا ہے"۔

"پھر آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟"

"جناب میری یہ مجال"۔

"اب بھی آپ مسکرانے سے باز نہیں آرہے ہیں۔ آئینہ دکھاؤں"۔

اس غریب نے کبھی کاہے کو تبسم زیرِ لب کے ساتھ آئینہ دیکھا ہوگا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تب تو بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ لہٰذا معاف کرا کے اپنی جان چھڑائی۔

خیر ان صاحب کی گلو خلاصی تو ہوگئی اور قتل کی واردات بھی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر مسکرانے کی ہمہ وقتی عادت کی بنا پر تھانہ کچہری اور برسوں مقدمہ بازی کے تو ہم چشم دید گواہ ہیں۔ دو حضرات کی دوستی کسی معمولی سی بات پر ختم ہوگئی۔ دوستی ختم۔ قصہ ختم۔ لیکن اصل قصہ اب شروع ہوتا ہے۔ ان میں ایک تنک مزاج تھے اور دوسرے بے نیاز اور بے نیاز صاحب کے پاس سرمایہ تھا تبسم زیرِ لبی کا۔ جب وہ اپنے سابق دوست اور حالیہ دشمن کو دیکھتے۔ عادتاً مسکرا دیتے۔

وہ سمجھتے مسکراہٹ کے تیر انھیں چھیڑے جانے کی خاطر برسائے جا رہے ہیں۔ محلہ ایک۔ دفتر ایک۔ اکثر آمنا سامنا ہوتا۔ ان کے تبسم کی تابناکی میں کوئی فرق نہ آتا۔ تنک مزاج نے ہتکِ عزت کا دعویٰ ٹھونک دیا۔ فریقِ ثانی مہینوں اپنی نیک نیتی اور بے گناہی کو مسکرا مسکرا کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر پانسہ الٹا ہی پڑتا تھا۔ جج صاحب سخن فہم بلکہ تبسم فہم تھے تنگ آکر ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ مقدمہ خارج کر دیا۔

ارے صاحب ایک مقدمہ خارج ہوا۔ ایک سلسلہ ختم ہوا۔ مگر اس تبسم سے کیسے کیسے سلسلوں کے ڈور الجھ جاتے ہیں۔

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

جانے کتنی حسینائیں اپنی اس عادت و فطرت سے کتنوں کو بے وقوف بناتی ہیں اور کتنے خود بے وقوف بن جاتے ہیں۔ اس تبسم کے سہارے عاشق صادق آسمان سے تارے توڑ لائیں۔ سوکھے گیلے ہر کنوئیں میں چھلانگ لگا دیں۔ چھوٹی سے چھوٹی فرمائش پوری کرنے کے لیے بازار کے چکر لگائیں۔ دفتروں کی خاک چھانیں۔ آپ کے امتحان کی تیاری کے لیے خود رات رات بھر جاگ کر کتابیں پڑھیں، نوٹس تیار کریں اور نقل کی پرچیاں بنائیں۔ بعد میں آپ کے انکار پر وہ شکایت کریں اور آپ کو آپ کی مسکراہٹ یاد دلائیں تو آپ فرمائیں:

"یہ تو ہماری عادت ہے"۔

واقعی یہ وہ ریشمی سرسراتا رنگین پردہ ہے۔ جس کے پیچھے کیسی کیسی دلنوازیاں اور کیسے کیسے ستم چھپے ہیں۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ مگر اف نہیں کر سکتا۔

یہ سب تو فطرت، عادت، حماقت، شرافت والے زیرِ لب تبسم کی تصویریں ہیں۔ اگر یہ حماقت و شرافت کے نتیجے میں آپ کے ہونٹوں پر نہیں ہے تو پھر اسے حاصل کرنے اور اپنانے میں آپ نے اپنی پوری ذہانت استعمال کر ڈالی ہے کہ اسے دانستہ لبوں پہ سجائے رکھنا بڑا مشکل فن ہے۔ کلاسیکی شاعری، کلاسیکی موسیقی، نقاشی اور مصوری کی طرح بلکہ فلسفہ اور ریاضی کی طرح۔ اور ہمارے خیال میں آج کا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ بھی اس کے آگے کچھ نہیں۔ کیا شطرنج کی چالیں ہوں گی جو اس کی ہیں۔ کبھی سیدھی، کبھی دائیں۔ کبھی بائیں۔ کبھی ایک گھر کبھی ڈھائی گھر۔ پھر شہ اور مات۔

اس کا کاٹا تو ایک بوند پانی نہیں مانگ سکتا۔

یہی سیاست دانوں کا بھی ہتھیار ہے۔ اسی کا بول بالا ہے۔ اسی کا بازار گرم ہے۔ اسی کے دام و دم میں اچھال ہے اور اسی کے دام میں ایک عالم گرفتار ہے۔ بہتی گنگا ہے۔ جس میں سب ہاتھ پیر دھو رہے ہیں۔ تو اس بھیڑ بھاڑ میں کامیابی کے لیے ہتھیار بھی تو مضبوط چاہیے اور حسین بھی۔ تبسم زیرِ لب کو آزمایئے۔ کامیابی آپ کے ساتھ۔

موسم آیا الیکشن کا۔ حالاتِ حاضرہ کے تحت اب تو ہر موسم الیکشن کا موسم ہے۔ پانچ سال کیا۔ مہینے دو مہینے کی بھی قید نہیں رہی۔ جب جس کا جی چاہا حکومت گرائی۔ جب جی چاہا حکومت بٹھائی اور پھر اٹھائی۔ یہ بازیچۂ اطفال بن گیا ہے۔ ہمارے آگے شب و روز تماشا ہوتا رہتا ہے۔ ہم خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہتے ہیں۔ بازی گر شرطیں لگا لگا کر کھیلتے رہے ہیں۔ ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ۔ کہ جیتنے اور کرسی پر جمے رہنے کا نسخہ یہی ہے۔ ہتھیار یہی ہے۔

جنتا کے سلام کو گاؤں گاؤں، گلی گلی۔ کوچے کوچے جائیں۔ ہاتھ جوڑے۔ ہونٹوں پر تبسم سجائے۔ وہ اپنی مانگیں رکھیں۔ نہ انکار نہ اقرار۔ کہ انکار کر نہیں سکتے اور اقرار پر قائم رہنا ممکن نہیں۔ بس مسکراہٹ کا سکہ اچھالیے۔ سمجھنے والا جو چاہے سمجھے۔ ہاں۔ نا۔

لیکن سمجھنے والے کو اتنی مہلت ہی کب ملتی ہے کہ حضور والا کے تبسم میں وہ مینا کاری ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کی عقل خبط اور چشم بینا۔ نابینا!

صفِ دشمناں پر بھی اسی ہتھیار سے حملہ کیجیے۔ وہ لاکھ برا بھلا کہیں، کیچڑ اچھالیں گالیاں دیں۔ ایک تبسم رہے سب کے جواب میں۔ وہ خود ہی پسپا ہو کر پیچھے ہٹ جائیں گے۔ جو ٹکر برابر کی ہوئی اور یہی تیر آپ پر برسائے جانے لگیں تو اپنے تبسم میں اور مہارت و دلآویزی پیدا کیجیے۔ یہ تو فن ہے۔ نکھرتا ہی چلا جائے گا۔

سیاست کی باگ ڈور اہلِ سیاست کے ہاتھوں دے دیں۔ ہم چلیں سفارت خانوں کے دورے پر۔ ویسے یہ بھی سیاست کا ہی ایک رخ ہے۔ لیکن ذرا بدلا بدلا۔ سنبھلا سنبھلا۔ یہاں بھی مسکراہٹ کا بول بالا ہے۔ قہقہوں ہنسی ٹھٹھوں کی اجازت نہیں۔ میزبان سفیر بس ہمہ وقت مسکراتے ہی پائے جائیں گے۔ یہ ان کے فرائضِ منصبی کا لازمی حصہ ہے۔ اس تبسم زیرِ لب کا رنگ روپ، چمک دمک، فیشن، اسٹائل بلکہ لمبائی چوڑائی سب آفیشیل کوڈ آف کنڈکٹ کے حساب سے ہوتی ہے۔ اس میں ان کی مرضی کو ذرا دخل نہیں۔ جس ملک سے تعلقات خوشگوار ہیں اس کے لیے مسکراہٹ زیادہ رنگین اور طویل۔ جس سے خراب ہیں اس کے لیے نمکین اور مختصر۔

سفارت خانے سے بھی نکل لیجیے۔ علم و ادب اور اہلِ دانش و بینش کی محفل کا رخ کریں۔ یہاں بابائے اردو اور دادائے فارسی جو فرما رہے ہیں وہ ہماری آپ کی سمجھ سے تو ایک قد آدم بلند ہے۔ لیکن حیرت زدہ ہو کر جس تس کا منہ تکنے اور خود کو ڈگری یافتہ جاہل ثابت کرنے کے بجائے بس مسکرایئے زیرِ لب۔ حاضرین و ناظرین آپ کی علمیت پر ایمان لے آئیں گے۔ بلکہ اگر آپ کی مسکراہٹ زیادہ فنکارانہ ہوگئی تو تقریر اور بحث کرنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اس خوف سے کہ صاحبِ تبسم کی علمیت کے آگے خود ان کی اپنی قابلیت کا بھرم نہ کھل جائے۔

تو حضور اس تبسم زیرِ لب کے کیا کہنے ہیں۔ اس کے ہزار جلوے ہیں روشن بھی تاریک بھی۔ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے اور سفر ہے کہ تمام ہوا جاتا ہے۔

□□□

Shafeeqa Farhat
24 Topty Apartment,
Roshanpura
Bhopal-460002 (M.P)

فرہنگِ آصفیہ سے

بَرزَخ ۔ ع۔ اسم مذکر (۱) حایل۔ روک۔ مزاحمت (۲) عرصہ۔ وقفہ (۳) مرنے سے قیامت تک کا زمانہ۔ دارالعمل اور دارالجزا کے درمیان کا عرصہ (۴) تصوری شکل۔ خیالی صورت۔ جیسے پیر کی برزخ (۵) وہ چیز جو دو مخالف چیزوں کے بیچ میں حایل ہو اس میں یہ دونوں مخالف چیزیں باہم مخالفت رکھتی ہوں یا نہیں۔ جیسے اعراف بہشت اور دوزخ میں۔ بندر انسان اور حیوان میں۔ مردم گیاہ نباتات اور حیوانات میں مونگا نباتات اور جمادات میں برزخ ہے (۶) ہیئت۔ شکل۔ دھج۔ چیشتا۔

پر لگنے کے بعد

مہناز انور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے ممّا پاپا کے آنگن میں سارا دن چڑیوں کی طرح چہچہایا کرتی تھی۔ ہم نے بہت لوگوں سے سنا ہے کہ بچپن میں ڈسپلانڈ تھی۔ چار سال تک اپنے گھر کی اکیلی لاڈلی رہی۔ پھر میرا ساتھ دینے، میری ہم راز بننے اور میرے ساتھ کھیلنے میری ایک اور بہن نے اس گھر میں آنکھیں کھولیں...... یہ بچپن ہنستے کھیلتے کیسے گزر گیا، اس کا بالکل پتہ ہی نہیں چلا۔

ممّا کو اکثر کہتے سنا کہ لڑکیوں کا کیا؟ یہ تو چڑیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی قسمت کب کہاں اڑا کر لے جائے اس کا کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا اور ایک دن وہ بھی آ گیا، کہ میری قسمت، مجھے اڑا کر دبئی لے آئی۔ سارے ناطے، سارے رشتے، ساری یادیں اپنے پروں میں سمیٹے، میں ایک نئے آشیانہ میں، ایک نئی زندگی کو سمجھنے میں الجھ گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ پرانے پر گرتے رہے اور نئے پر ایک نئی پرواز پر آمادہ کرنے لگے، ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی کڑیاں جڑتی گئیں اور میں ممّا کو برابر یقین دلاتی رہی کہ آپ کی چڑیا اڑ کر آپ سے بہت دور آ گئی ہے۔ مگر اس کی آنکھوں اور یادوں میں ہمیشہ آپ کے جوڑے ہوئے تنکوں سے بنا آشیانہ تر و تازہ رہتا ہے۔

چند سالوں میں زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ ہمارے گھر میں بھی ایک پیارے سے بیٹے نے آنکھیں کھولیں، ہم نے فوراً اپنے شوہر سے کہا خدا کا شکر ہے ہمیں کسی چڑیا کے اڑ جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ یہ ہمارا بیٹا ہے، جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ یا ہم اس کے ساتھ رہیں گے۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کا نام آریز رکھا جو زندگی کا محور و مرکز بن گیا۔ سارا سارا دن اسی کی پرورش اور دیکھ بھال میں گزرنے لگا۔ قدرت کی طرف سے یہ ایک عجیب و غریب کھلونا تھا جس کے ساتھ رہتے رہتے ہم نے زندگی کے کئی نئے رنگ دیکھے ابھی آریز صرف پانچ ماہ کا تھا کہ مجھے دوسری خوش خبری ملی۔ ڈاکٹر کے فیصلے کن لہجے کا ہمیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا مگر یہ سچائی تھی اور اس طرح صرف چودہ مہینے کے بعد دوسرا بیٹا ہیثم ہماری گود میں تھا، ہم نے ایک عجیب طرح کا اطمینان اور سکون محسوس کیا اس بار شوہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ بھی تمھارے پاس رہے گا اس کے بھی اڑ کر جانے کا تمھیں کوئی خطرہ نہیں۔

اتنے کم فرق کی وجہ سے دونوں ساتھ ساتھ پلنے بڑھنے لگے۔ دونوں کے ڈائپر ساتھ چینج ہوتے۔ دونوں کی دودھ کی بوتلیں ساتھ بنتیں اور دونوں کے ساتھ ہی کھلونے آتے آہستہ آہستہ دونوں کے مزاج کا فرق سامنے آنے لگا۔ ہیثم کو کاروں کا شوق بڑھتا گیا طرح طرح کی کاریں انھوں نے جمع کرنا شروع کیں اور آریز کا جانوروں اور پرندوں کا شوق انتہا تک پہنچ گیا۔ طرح طرح کے جانور ہر روز کھلونوں میں آتے اور ان کا کمرہ ایک چڑیا گھر بن گیا۔

اسکول شروع ہونے کے بعد تھوڑا سا ذہن بدلا۔ اب انھیں کھیلنے کے لیے وقت کم ملتا۔ لیکن ہمیں تھوڑی سی فرصت ملنے لگی۔ آفس سے آنے کے بعد اور آریز و ہیثم کے اسکول سے آنے کے درمیان ہمیں جو بھی وقت ملتا ہم بڑے سکون سے اس میں کوئی بھی کام کر سکتے تھے۔ ان فرصت کے اوقات میں ہماری باغبانی کا شوق خوب پروان چڑھا۔ کھلی کشادہ بالکنی میں گملوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ ہریالی نے بالکنی کو ایک دلفریب رونق دی۔ اس شوق میں بھی ہمارے شوہر ایاز نے پورا ساتھ دیا۔ انھیں نرسری اپنے کسی دوست یا آفس کے مالی کی مدد سے جو بھی پودے یا بیج ملتے وہ ایک

ایک گملے کا اضافہ کرتے رہے۔ اس بالکنی میں تو بہار کا سماں پیدا ہو گیا۔ بچے بھی یہاں بہت خوش رہنے لگے اور بالکنی میں رکھے جھولے پر دیر تک دونوں جھولتے رہتے۔ اب تو اس دلکش جگہ پر چائے پی جانے لگی۔ دوست واحباب اور رشتہ داروں کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آنے والا جیسے ہی دبیز پردوں کو ہٹا کر شیشے کے دروازوں کے پیچھے چھپی بالکنی کو دیکھتا وہیں بیٹھ کر چائے پینے کی فرمائش کرتا۔ بہرحال چائے پکوڑے سے لے کر حقے کی گڑگڑاہٹ تک اس بالکنی میں گونجنے لگی۔

اس پُر بہار باغیچے میں کھڑے ہو کر دور نظر آتا سمندر اور سمندر میں غروب ہوتا ہوا سورج کا نظارہ نہایت دلفریب اور پرکشش منظر پیش کرتا۔

ایک دن اس بالکنی میں ایک نیا منظر دیکھنے کو ملا۔ ایک خوبصورت چڑیا مع اپنے جوڑے کے اس باغ میں ٹہلنے آ گئی۔ دونوں بیٹوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ جلدی سے دونوں بھائی اس کی خاطر مدارت کے لیے کھانے کی چیزیں تلاش کرنے لگے مگر اس جوڑے نے زیادہ مہلت نہیں دی اور اڑ کر غائب ہو گیا۔ آریز ہاتھ ملتے رہ گئے ہم نے انہیں بہلانے کے لیے کہا آج تو وہ جگہ دیکھنے کے لیے آئے تھے اگر انہیں پسند آئی ہوگی تو وہ روز آئیں گے اور پھر ہم انہیں بہت سی چیزیں بھی کھلائیں گے۔

اور ان کے دوسرے دن کے آنے کی امید میں ہم نے بہت سی تیاریاں کر ڈالیں۔ کئی دوستوں سے فون پر یہ ماجرا بتایا اور پوچھا کہ چڑیاں شوق سے کیا کھاتی ہیں پتہ چلا ویسے تو پتہ جانے کیا کیا گرید گرید کر کھاتی رہتی ہیں مگر باجرا سبھی چڑیاں شوق سے کھاتی ہیں۔ اب باجرے کی تلاش میں ہم لوگوں نے کئی گراسری میں فون کر ڈالے مگر پتہ چلا کہ روولا میں ایک پاکستانی گراسری ہے جس میں مل سکتا ہے۔ ہمیں بھی یقین آ گیا، کیونکہ وہاں ایسی الگ طرح کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ اس سے پہلے انڈین جھاڑو بھی بہت ڈھونڈنے کے بعد ہمیں اسی گراسری میں ملی تھی۔ اندازہ صحیح نکلا۔ ہمیں باجرا وہیں مل گیا۔

اب بالکنی میں ایک کٹوری میں پانی، باجرا، بریڈ کے کچھ ٹکڑے ڈال دیے۔ آریز میثم نے تو اپنے پسندیدہ چاکلیٹ، کیک کے بھی کچھ ٹکڑے چپکے سے ڈال دیے۔ آئندہ روز بچے تو اسکول چلے گئے اور آفس سے آنے کے بعد میں نے بھی پردے ہٹا ہٹا کر کئی بار ان چڑیوں کو تلاش کرتی نظروں سے دیکھا، مگر چڑیوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

ہمارے گھر کے ایک اور فرد نائن ہیں، جن کے بغیر گھر کی ایسی صفائی اور سجاوٹ ممکن نہیں۔ وہ جیسے ہی بالکنی کی طرف صفائی کے لیے بڑھے، ہم نے انہیں روک دیا۔ آج رہنے دو نائن، شاید کل چڑیاں آئیں۔

کئی دن اسی طرح انتظار میں گزر گئے۔ ہم سب چڑیوں کے قصے بھول گئے تھے کہ ایک چھٹی کے دن ہم سب گھر پر تھے۔ پھر وہی جوڑا، پھدکتا، اتراتا، ایک دوسرے کو چھیڑتا، اپنے آپ میں گم، نمودار ہوا اور اس بار تو اڑ کر چلا جاتا اور پھر آ جاتا۔ ایک دن میں اس نے کئی چکر لگا ڈالے۔ ایسا لگا کہ آج تو انہیں یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔ اب تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ یہ جوڑا روز آتا اور ہم لوگ انہیں کھانے پینے کی طرح طرح کی چیزیں دیتے۔ اب تو یہ بالکل پالتو چڑیا جیسی ہو گئیں۔ بڑی بے تکلف، اب ذرا سی آہٹ پر اڑتی بھی نہیں تھیں۔ ان چڑیوں سے ہم سب کی دلچسپی بڑھتی گئی۔

ایک دن دیکھا...... لٹکے ہوئے گملوں میں بھی چڑیاں چڑھی جھولا جھول رہی ہے۔ اس نے اسی گملے کو اپنی آرام گاہ بنا لیا، نائن نے فوراً ہٹانے کی کوشش کی، مگر آریز، میثم نے انہیں روک دیا۔ مگر بات جھولا جھولنے تک نہیں رہی۔ نائن نے بتایا گملے کی مٹی کرید کرید کر وہ نیچے گرا رہی ہے، یہ گندگی دیکھ کر تو جب بھی اسے ہم لوگ گملے پر دیکھتے، اڑا دیتے۔ آخر تنگ آ کر ہم نے نائن سے کہا ایسا کرو یہ ایک ہی گملے پر آتی ہے، اس کی جگہ بدل دو۔ یہاں پر یہ چھوٹا گملا لگا دو۔ جگہ بدلنے سے شاید وہ اپنی حرکت سے باز آ جائے۔ نائن جیسے ہی اسٹول پر چڑھ کر گملا اٹھانے لگا، پتہ چلا کہ دودھ کے ڈھلے دو انڈے وہاں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ اس خبر نے تو، ارادہ ہی بدل دیا۔ ہم نے کہا نائن اب تو یہ انڈوں سے بچے نکال کر ہی پیچھا چھوڑیں گی۔ چلو چھوڑو۔ بس نیچے صفائی کر دو اور اس کٹوری کا پانی بدل دو۔

آریز، میثم انڈوں سے بچے نکلنے تک کا سفر سن کر بہت خوش ہوئے۔ اب دونوں بڑی احتیاط سے کام لیتے۔ دبے قدموں بالکنی میں جاتے اور چڑیوں کو بالکل ڈسٹرب نہیں کرتے۔ اللہ اللہ کر کے چوں چوں کرتے بچے بھی وجود میں آ گئے اور اب تو جیسے ہی چڑیا بچوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے جاتی ہم لوگ بڑے شوق سے گملے میں بیٹھے بچوں کو دیکھتے۔ دونوں بچے دھیرے دھیرے بڑھنے لگے۔ آریز، میثم نے ان کے نام چنٹو اور منٹو رکھ دیے۔ اب تو بالکنی کی چہل پہل کا رنگ ہی الگ تھا۔ جھولتے ہوئے گملے کے اندر خوبصورت گھونسلہ اور اس کے اندر پھڑ پھڑاتے دو بچے۔ چڑیا جو کچھ ڈھونڈ کر کھانے کے لیے لاتی، دونوں بچے منہ کھول کر کھانے کے لیے تیار رہتے، چڑیا بچاری، ایک کی چونچ میں کچھ ڈالتی تو دوسرا چونچ کھول کر اپنی بے چینی دکھاتا، یہاں تک کہ لایا ہوا سارا کھانا ختم ہو جاتا اور چڑیا پھر اڑ کر کچھ تلاش کرنے نکل جاتی۔

یہ دیکھ کر خیال آتا انسان، جانور اور پرندے ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہوئے بھی کتنی مماثلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح آریز

میثم کو ہم بھی تو کھلانے بیٹھتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ چیز کھاتے وقت بالکل ایسا منظر ہوتا ہے، ایک کے منہ میں لقمہ رکھو تو دوسرا منہ کھولے رہتا ہے۔

ہر دن چڑیوں کے بچوں میں کچھ اضافہ ہوتا گیا۔ ایک دن دیکھا کہ دونوں نیچے گرے پڑے ہیں۔ یہ گرے نہیں تھے، بلکہ یہ ان کی پرواز کی پہلی کوشش تھی، ہم نے سوچا کہ ابھی تو ان کی جان کو خطرہ ہے۔ انھیں اٹھا کر اوپر گملے ہی میں رکھ دیا، لیکن فکر ہوئی کہ ہمیں ان کی رہائش کا کوئی باقاعدہ انتظام کرنا چاہیے۔ اسی دن شام کو ایک پنجرا بھی آ گیا۔ پنجرے کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ یہ باہر نکل کر ٹہلتے اور پھر اندر چلے جاتے، کچھ دنوں بعد ایک بچہ غائب ہو گیا۔ دوسرا اڑ کا بیٹھا شاید تنہائی کا سوگ منا رہا تھا۔ ہم نے سوچا دو واڑنا سیکھ گیا ہوگا، سیر کرنے گیا ہوگا، آ جائے گا، مگر وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ آریز اور میثم نے بڑا سوگ منایا۔ برا تو ہم لوگوں کو بھی بہت لگا مگر پرندوں کی خصلت سمجھ کر نظر انداز بھی کر دیا۔ ابھی تین چار دن ہی گزرے تھے کہ دوسرا بچہ بھی غائب ہو گیا۔ شاید اُسے بھی پرواز کا ہنر آ گیا تھا۔ پنجرا خالی دیکھ کر یقیناً بہت دکھ ہوتا۔ بیچاری چڑیا بھی گاہے گاہے آتی، خالی پنجرا اور جھولتا گملا دیکھ کر...... چلی جاتی۔ آریز اور میثم کے پاس بہت سارے سوالات تھے۔ بچے کیوں چلے گئے؟ ان کے اماں ابا انھیں ڈھونڈ رہے ہیں، وہ کہاں گئے ہوں گے؟ ہم نے ہر ممکن انھیں سمجھانے کی کوشش کی، مگر آریز کے سوالات بڑھتے گئے۔ آخر ہم نے آریز کے ذہن کو ہٹانے کے لیے اس سے پوچھا۔ آریز تم اور میثم تو اس طرح ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟ آریز رونے لگا، نہیں ہم کہیں نہیں جائیں گے اور میثم تم؟ اس کے جواب نے ہم سب کو ہنسا دیا۔ جب آپ ہمیں پریشان کریں گی تب ہم چلے جائیں گے اور ہم نے ہنستے ہوئے دونوں کو گلے سے لگا لیا۔

دھیرے دھیرے آریز اور میثم کے کلاس آگے بڑھنے لگے۔ پڑھائی کی ذمہ داری بڑھتی گئی۔ اب کہیں آنا جانا، اور گھومنا پھرنا، کم ہوتا گیا۔ دونوں وقت کے ساتھ سمجھدار ہوتے گئے، پڑھائی کی ذمہ داری بڑھتی گئی۔ اپنے اپنے کمروں میں ذمہ داری سے پڑھتے اور اچھی پوزیشن سے پاس ہوتے، کھانا ہم سب ایک ساتھ کھاتے تھے۔

کبھی کبھی ہم گزری باتوں اور یادوں کو دہراتے۔ تم لوگوں کو یاد ہے؟ کہ پہلے اماں تم دونوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھیں۔ دونوں کو ہوم ورک کراتی تھیں۔ اور کھلونوں سے کھیلنے میں ابا تم لوگوں کی بہت مدد کرتے۔ جب بھی نئے کھلونے لاتے، انھیں جوڑ کر سیٹ کرتے اور تم لوگ پٹریوں پر دوڑتی کاریں اور ٹرین کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے...... دونوں کو ایسی باتیں سن کر بڑا مزہ آتا۔

دونوں بچوں کی پڑھائی اور الگ طرح کی مصروفیت نے ہم دونوں کو بہت اکیلا کر دیا تھا۔

سرد موسم کی شروعات تھی۔ ہواؤں میں خنکی آنے لگی تھی۔ کچھ باہری پرندے سمندر کے کنارے اور میدانوں میں جھنڈ کے جھنڈ نظر آنے لگے تھے۔ پبلک پارکوں اور تفریحی جگہوں کی رونقیں بڑھنے لگی تھیں۔ ہم لوگوں نے آریز اور میثم سے کہا، اس وقت تو انڈیا میں بھی بہت اچھا موسم ہوگا۔ چلو صرف ایک ہفتہ کے لیے وہاں گھوم کر آتے ہیں۔ آریز نے سنتے ہی کہا، ارے آپ نے بابا کی میل نہیں پڑھی؟ وہ ایک ہفتہ کے لیے امریکہ سے ہم لوگوں کے پاس آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا تم بھائی صاحب کی بات کر رہے ہو! نہیں ہم نے تو نہیں دیکھی۔ ایاز آپ کو پتہ ہے، ہاں آج ہی صبح میل دیکھی ہے۔ ابھی ریزرویشن نہیں ہوا ہے۔ صرف ارادہ ہے، ہم نے کہا تو فون کر کے معلوم کر لیجیے۔ کہ کتنے دنوں کا پروگرام ہے؟ پتہ چلا بھائی صاحب کسی ضروری کام سے صرف ایک ہفتہ کے لیے آ رہے ہیں۔

بھائی صاحب کافی دنوں بعد آریز اور میثم سے ملے تھے۔ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انھیں اپنا ڈسپلن، اپنی پڑھائی کا شوق ان بچوں میں نظر آیا۔ ان سے بہت گھل مل گئے۔ زیادہ تر آریز اور میثم کے ساتھ ہی رہتے اور یہ لوگ بھی خوب کھل کر بات کرتے۔ ان کے پسندیدہ سبجیکٹ کیا ہیں؟ اور آگے یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں، سب کچھ ان لوگوں نے اپنے بابا سے بتایا۔ ان کا ایک ہفتہ بہت جلد بیت گیا۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگ اپنی نارمل زندگی کی طرف پھر لوٹ آئے۔

آریز اور میثم کی پڑھائی اب ایک سنجیدہ اور فیصلہ کن موڑ پر آ چکی تھی۔ دونوں نے اس بار بہت اچھے نمبروں سے بارہواں کلاس پاس کیا تھا۔ اب دونوں کو گریجویشن کے لیے داخلہ لینا تھا۔ ابھی تک ان کے سارے فیصلے ہم لوگ کرتے آئے تھے۔ اور اسی خوش فہمی میں تھے کہ ہم ہی اب بھی ان کے فیصلے کریں گے۔

ہم لوگ رات کا کھانا کھا کے ایک ساتھ بیٹھے تھے کہ ایاز نے پوچھا۔ ہاں بھئی بتاؤ تم لوگ اب کیا کرنا چاہتے ہو؟ آریز اور میثم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور خاموش رہے۔ ہم نے کہا، آپ بتایئے انھیں کیا کرنا ہے؟ یہ کیا بتائیں گے ابھی یہ اتنے بڑے نہیں ہوئے ہیں کہ...... اتنے میں میثم نے کہا، نہیں اماں اب ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں، آریز اور ہم نے سوچا ہے کہ ہم لوگ گریجویشن کرنے امریکہ جائیں گے۔ بابا سے ساری بات ہو گئی ہے۔ بابا نے ہمیں اپنے پاس بلایا ہے اور کہا ہے، یہاں کی ایجوکیشن کا اسٹینڈرڈ بہت اچھا اور بہتر ہے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ کیا واقعی یہ دونوں اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ اتنا کچھ ہو گیا اور ہم لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلا، ہم نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا، اور کہا بیٹا تم کو نہیں پتہ گھر سے دور رہ کر بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تم لوگ تو ہم لوگوں سے کبھی الگ نہیں رہے۔ پھر بھلا ہم لوگوں کے بغیر کیسے رہ پاؤ گے؟؟

مگر تمام سوال و جواب، بحث و مباحثہ کے بعد نتیجہ یہی نکلا کہ دونوں امریکہ جائیں گے اور جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایجوکیشن ویزا سے لے کر امریکہ پہنچنے تک کی تمام باتیں ہر وقت نیٹ پر بھائی صاحب سے ڈسکس ہوتی رہتیں۔ ایاز نے تو ہمت جتائی تھی لیکن ہم اپنے آپ کو کسی طرح نہیں سنبھال پا رہے تھے۔

جانے کے دن جیسے جیسے قریب آ رہے تھے، میری آنکھوں کی نمی نے ایک مستقل جگہ بنالی تھی۔ پتہ نہیں یہ نمی آریز اور میثم کو نظر بھی آ رہی تھی کہ نہیں......؟؟ امید تھی کہ آج ویزا ضرور آ جائے گا، اسی لیے آج تو نمی نے ایک بہاؤ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

آریز اور میثم دونوں ایک ساتھ مسکراتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ہمیں لگا کہیں ویزا ملنے کی خبر مل گئی ہے، مگر ہم نے کچھ بھی نہیں پوچھا، دونوں دائیں بائیں آ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا صبح بغیر کچھ کھائے تم لوگ نکل گئے تھے، ہمیں بھی بھوک لگی ہے، چلو کھانا کھاتے ہیں۔ آریز نے گود میں سر رکھ دیا، نہیں ہمیں تو بالکل بھوک نہیں لگی ہے۔ میثم نے کہا بھوک تو بہت زوروں کی لگی ہے لیکن آپ کے پاس آتے ہی غائب ہو گئی...... ہم نے سوچا اب یہ دونوں ہم کو بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑا حوصلہ کر کے ہم نے پوچھا؟ ویزا مل گیا، کب کی فلائٹ کرائی ہے؟۔

آریز نے گلے میں ہاتھ ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا...... کہاں کا ویزا؟ کیسی فلائٹ؟ اماں ہمیں آپ نے چنٹو اور منٹو سمجھ لیا ہے کہ پر آتے ہی اڑ گئے...... ہم آریز اور میثم ہیں، آپ کے بیٹے، کہیں نہیں جائیں گے، آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گے اور جہاں جائیں گے، آپ لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے۔

میری آنکھوں کے بہتے ہوئے سارے آنسوؤں کو آریز اور میثم نے اپنے رومالوں میں جذب کر لیا۔ جو کہ یقیناً خوشی کے آنسو تھے۔

Dr. Mehnaz Anwar
529/897 A, Panchvati Colony
Rahim Nagar, Lucknow-226006 (U.P)

فرہنگ آصفیہ سے

بَری۔ ۔ اسم مؤنث۔ وہ سامان جو ساچق کے روز بری یعنی دولہا کی طرف سے دلہن کے ہاں آرائش اور باجے کے ساتھ جاتا ہے جس میں کنبے کی عورتیں اور چند مرد بھی ہمراہ ہوتے ہیں ساچق چڑھنے کا وقت سہ پہر سے مغرب تک ہے۔ بعض اوقات دلہن کے گھر تک پہنچتے پہنچتے رات بھی ہو جاتی ہے۔ امیروں کے ہاں چاندی کا سہاگ۔ پڑا۔ اسمیں دو سونے چاندی کی کنگھیاں سہاگ کا عطر اور پھلیل منقش شیشوں میں سرخ کاغذ کی سنہری کٹوریاں لگی ہوئی تھیلی جس کے اندر چھیل چھبیلا۔ ناگرموتھا۔ بالچھڑ۔ چھوٹی الائچی۔ کپور کچری۔ لونگیں۔ چنبہ کی جڑ۔ ہلدی۔ جوز۔ جوتری۔ تیز پات۔ صندل۔ زعفران۔ مشکدانہ اور مسی کی دو پڑیاں ہوتی اور اسی کو سہاگ پڑا کہتے ہیں۔ گلاب کے منقش شیشے ایک چاندی کے چوگھڑی میں رکھے ہوئے (چاندی کی چار ٹھلیاں دو میں دودھ دو میں شربت بھرا ہوا۔ ان کے گلے میں سونے چاندی کی مچھلیاں کلاوے سے بندھی ہوئی) سوا پانچ سیر کھانڈ پانچ سیر قند۔ ڈھائی سیر مہندی کے تین پڑے باوا قریش کے نام کے جس پر سونے روپے کے خول چڑھے ہوتے ہیں۔ گیارہ سیر مہندی پانچ سیر کلاوے پچیس من نقل پانچ من قرص گیارہ من میوہ۔ بری دو طرح کی ہوتی ہے ایک پکی بری جیسی یہاں لکھی جاتی ہے۔ دوسری کچی جس میں اشیائے مخصوصہ کی بجائے نقد روپیہ دے دیا جاتا ہے دہلی سے اس کا دستور اٹھ گیا شاذ و نادر غریب یا وہ شخص جس کا کنبہ اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اس قدر سامان ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ کچی بری مانگ لیتا ہے مگر یہ طریقہ داخل عیب ہے البتہ باہر والوں میں یہ دستور ابھی تک بعض خاندانوں میں مروج ہے۔ سہاگ پڑا ایک بہت بڑی کاغذ کی تھیلی جس میں خوشبو کی ادویات ہوتی ہیں اور وہ ریت رسم کے موقع پر دولہا سے اور سہاگنوں سے پسوا کر دلہن کی مانگ میں لگایا جاتا ہے۔ سہاگ کا عطر جو خوشبودار ادویات سے تیار کیا جاتا ہے اس میں اکثر وہی چیزیں ڈالی جاتی ہیں جو سہاگ پڑے میں ہوتی ہیں۔ بابا فرید حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے مراد ہے جو ایک مشہور ولی کامل خاندان چشتیہ سے ۔ہجری میں گزرے ہیں آپ کا مزار پر انوار پٹن واقع پنجاب میں جسے پاک پٹن بھی کہتے ہیں اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے مفصل دیکھو لفظ اولیائے ہند۔ نُقل ایک قسم کی شیرینی جس کے اندر پستے۔ چنے۔ بادام یا مونگ پھلی رکھ کر گول گول لڈو سے بنا دیتے ہیں۔ قرص سرخ یا سبز کھانڈ کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں جو بری کے ساتھ جاتی ہیں۔

ہمراہی اور منزل

چشمہ فاروقی

ہماری بس جیسے ہی سہارنپور بس ڈپو سے باہر نکلی وہ ضعیف عورت (جو ہماری اگلی سیٹ پر براجمان تھی) روتے ہوئے چلانے لگی اوہ......! میرے شوہر رہ گئے۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو بیچ بزرگ خاتون کے پاس دوسری سیٹ خالی تھی۔ میں نے بس کنڈکٹر سے تھوڑا تیز ہو کر کہا او بھائی ان کے شوہر کو لیے بغیر تم نے بس چلا دی، بس چلانے سے پہلے مسافروں کو چیک کر دیا پھر معلوم تو کر و کہ ان کے ساتھ موجود سواری بلا لے۔ خاتون مسلسل ایک ہی جملہ دہراتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ کنڈکٹر نے جب بزرگ کو غائب پایا اور اس عورت کو زور زور سے زار و قطار روتے دیکھ کر ساتھ ہی بقیہ مسافروں کو دیکھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ بس واپس ڈپو لے چلے۔ ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے آگے سے موڑ کاٹ کر بس واپس ڈپو میں داخل کر دی اور اسی جگہ روک دی جہاں کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے روکی تھی۔ بس رکتے ہی کنڈکٹر، میں اور کچھ سواریاں ان بزرگ حضرت کو ڈھونڈنے کے لیے بس سے اتر پڑے۔ بھیڑ میں انھیں ڈھونڈنا مشکل تھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک میری نظر ٹکٹ بوتھ کی طرف گئی وہ بزرگ وہاں کھڑے تھے، میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچا تو وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہاں رہ گئے تھے بابا، کب سے تمھیں ڈھونڈ رہے ہیں، چلو آپ کے لیے بس وہاں رکی کھڑی ہے۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو ان کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ روتے روتے بولے باتھ روم گیا تھا اس لیے دیر ہو گئی وہاں لائن لگی تھی۔ پھر شکایت کرتے ہوئے بولے ایسے کوئی مسافر کو چھوڑ کر جاتا ہے کیا، 'نالائق'۔ میں نے بغیر جواب دیے ان کا ہاتھ تھاما اور بس کی طرف چل پڑا، ساتھ ہی بس کنڈکٹر کو ڈھونڈنے لگا، وہ بھی پریشانی اور فکر مندی میں تھا۔ میں نے جب اسے آواز دی تو اسے بھی اطمینان ہوا۔ جیسے ہی ہم بس میں داخل ہوئے تو دیکھا وہ بزرگ دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں اور کچھ عورتیں انھیں تسلی دلا رہی تھیں۔ اپنے شریک سفر کو آتا دیکھ کر کمزور ہونے کے باوجود ان میں قدرتی ایسی طاقت آ گئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک دم سے اپنے شوہر سے لپٹ گئیں اور اس وقت ہم سارے مسافروں نے جو منظر دیکھا اس نے ہم سب کی آنکھیں نم ناک کر دی۔ وہ بزرگ جوڑا یقیناً جو اپنی زندگی کی صدی کے بے حد قریب تھے گلے مل کر بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بھی دونوں اسی کیفیت میں تھے جو ان کے گہرے پیار کی عکاسی کر رہی تھی۔ اسی حالت میں بزرگ خاتون نے اپنے شوہر سے کہا۔ اگر تم بچھڑ جاتے تو میں مر ہی جاتی۔ اس پر انھیں جواب ملا تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں تمھارے بغیر زندہ رہ لیتا۔ اس جواب پر بوڑھی خاتون نے اپنا سر شوہر کے کندھے پر دے مارا اور اپنی بوڑھی مگر پیار بھری نظروں سے ان کا منہ تکنے لگی۔ میں کیونکہ ان کے پیچھے والی سیٹ پر تھا اس لیے ان کی باتوں کا ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس عمر میں جہاں ان کی گہری محبت دیکھ کر مجھے رشک آ رہا تھا وہیں ان کے بولنے اور سننے کی طاقت پر بھی حیران تھا۔ جب کہ میں اور میری بیوی ساٹھ کی عمر میں ہی کمزور، نڈھال اور کم نظری کے بھی شکار تھے۔ اس میں شاید وقت حالات اور سکون بھی شامل ہے۔

بس ہائی وے سے گزر رہی تھی کچھ راستہ ناہموار تھا اس لیے بس ہچکولے کھا رہی تھی۔ انھیں ہچکولوں میں میرا ذہن بھی ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ میرے والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے ایک سال بعد زینب میری زندگی میں داخل ہوئی جو اپنے آپ میں حسین جمیل و خوبصورت تھی۔ آفس سے شادی کے لیے لی چھٹیاں ختم ہونے کے بعد سے ہی زینب نے یہ معمول بنا لیا کہ آفس جاتے وقت وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی اور ہاتھ کے اشارے سے اللہ حافظ کہتی۔ آفس سے لوٹتے وقت بھی دو آنکھیں

میری منتظر رہتیں۔ وہ میرے ہاتھ سے بیگ لے کر میرا خیر مقدم کرتی۔ وہ پہلے دن کی بات ہے، اس نے میری واپسی پر میرے جوتے کے تسمے کھولنے چاہے تب میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر کہا تھا نہیں زینب تم اس گھر میں میرے جوتوں کے لیس کھولنے نہیں آئی ہو۔ مجھے تمہاری یہ خدمت قطعی نہیں چاہیے۔ اس کا موڈ کچھ بدل گیا مگر میں نے اسے منا لیا۔

زینب نے آتے ہی ہمارے گھر کو جنت نشاں بنا دیا۔ ماں کا دل جیتنے کے ساتھ ہی اپنے حسن سلوک سے ہمسایوں کے دلوں کو بھی جیت لیا اور مثال بن گئی۔ چند سال بعد ہمیں اللہ کے فضل و کرم سے پہلے بیٹے کی شکل میں معظم عطا ہوا اور پھر معظمہ کی صورت میں بیٹی۔ یوں تو معظم کے آنے سے ہی والدہ کو قدرت کا کھلونا مل گیا تھا مگر معظمہ ان کی جان عزیز بن گئی۔ دادی کی بزرگانہ شفقت، ماں کی ممتا اور صحیح تربیت نے بچوں میں اخلاق و آداب سجا دیے۔ تعلیم میں بھی دونوں آگے آگے رہے۔ بچوں کی تعلیم کے دوران ماں ہمیں چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملی۔ ان کی موت کا غم جتنا مجھے ہونا چاہیے تھا اس سے کہیں زیادہ زینب کو ہوا۔ مرحومہ نے بھی اس کو اپنی بیٹی سے کم نہیں جانا تھا۔ وہ کئی مہینوں تک ماں کی جدائی کے غم میں ڈوبی رہی۔ گھر خالی خالی لگتا تھا۔ پھر جب ہم سنبھلے تو زینب نے پوری توجہ گھر اور گھر والوں پر مرکوز کر دی۔ معظم کی تعلیم پوری ہونے کے بعد میں نے اسے بڑی مشکلوں اور کوششوں سے سرکاری افسر بنا دیا۔ معظمہ نے بھی جب اپنی تعلیم پوری کر لی تب معظم کی دلہن لانے سے قبل ہی اس کا رشتہ ایک شریف عزت دار اور تعلیم یافتہ گھرانے میں ہو گیا جہاں وہ ہمارے نواسے اور نواسی کے ساتھ خوشحال اور مطمئن ہے اور پھر معظم کی دلہن اور اس کے بچوں کے ساتھ ہماری فیملی مکمل ہو گئی۔ یوں تو ہر ایک کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوا کہ موت ہو گئی ہوتی مگر اللہ نے 72 گھنٹے نکال دیے اور زندگی عطا کر دی۔ باقی زینب اور بچوں کی دن رات کی خدمت اور دعائیں ساتھ تھیں۔ ڈاکٹروں کی کوشش سے صحت یاب ہو گیا اور چند ماہ روزگار سے لگے رہنے کے بعد پنشن یافتہ ہو گیا۔ زینب اپنی بہو کے ساتھ گھریلو ذمہ داریوں میں لگی ہوتی تھی کہ اچانک اسے شوگر کے مرض نے جکڑ لیا جس نے اس کی جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ذہنی حالت پر بھی کافی اثر ڈالا۔ پھر ہائی بلڈ پریشر نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور اس میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا اور وہ بدمزاج ہو گئی۔ اس سے آنکھوں کی روشنی بھی متاثر ہوئی اور اسے چشمہ لگانا پڑا۔ اس کے مزاج میں ایک بڑی تبدیلی آئی کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھ پر جھنجھلانے لگی۔ بعض دفعہ اسے یہ بھی احساس نہیں رہتا تھا کہ ہمارے آس پاس کون ہے، اس کی یہ فطرت جب اپنی حد سے متجاوز ہو گئی تب میرا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ مگر میں اس حال میں بھی صبر و برداشت سے کام لینے لگا کیونکہ میں جانتا تھا کہ بہادر وہ نہیں جو مقابل کو زیر کرے بلکہ بہادر وہ ہے جو اپنے غصے کو قابو میں کرے۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ زینب کا وہ وقت جو ہر مرض سے خالی تھا وہ دل و جان سے ہماری خدمت کرتی رہی۔ ان خدمات کو میں کیسے فراموش کر دوں۔ آج جب کہ ان امراض کے لاحق ہونے سے وہ کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ بدمزاج چڑچڑی ہو گئی ہے، اتنی کہ وہ میری بے عزتی سے بھی نہیں چوکتی تو مجھے اس کی یہ ادا بھی قبول و گوارا ہے۔ ویسے بھی انسانی فطرت میں اس کے صبر و ضبط کی اپنی حد ہوتی ہے کوئی صبر و ضبط کر لیتا ہے تو کوئی بے قابو ہو جاتا ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ صبر کا مادہ اس نے مجھے زیادہ بخشا ہے۔

بس ایک گڈھے کی وجہ سے ایک جھٹکے سے اچھلی اور اس جھٹکے میں میرا ذہن اپنی سوچ سے باہر نکل آیا۔ اپنے بوڑھے وجود کو جب میں نے اپنے برابر میں بیٹھی شریک حیات زینت کے پاس پایا تو میں نے ایک پیار بھری نظر اس پر ڈالی۔ وہ ڈپو سے کھانا کھانے کے بعد سے نیند کے جھونکے لے رہی تھی۔ اسے کھانا کھانے کے بعد سونے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنا معمول اپناتی نظر آئی۔

آج جب کہ ہم عمر دراز ہو چکے ہیں اور میں پنشن یافتہ ہو چکا ہوں، میں آج بھی اس کی ہر فرمائش پہلے کی طرح اپنی پنشن سے پوری کرتا ہوں۔ اس وقت بھی اس کے بھائی کے گھر ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے جا رہا ہوں۔ اچانک میں نے نظر اٹھا کر اس بزرگ جوڑے کو دیکھا بزرگ خاتون اب بھی اپنے شریک زندگی کے کاندھے سے ٹیک لگائے نیند سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور بزرگ کمزور ہونے کے باوجود بھی خود کو تن کر بٹھائے ہوئے اپنی بیگم کو آرام کی غرض سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بیوی پر نگاہ ڈالی، مجھے آج بھی وہ پہلے کی طرح معصوم نظر آئی۔ اس کے سوئے ہوئے وجود اور معصومیت سے متاثر ہو کر میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ اللہ ہمیں اور ہمارے پیار کرنے والوں کو سلامت رکھیو اور اس دعا پر خود ہی آمین کہا۔ بس ہماری زندگی کے سفر کی طرح تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی مگر منزل اب بھی کافی دور تھی۔

Chashma Farooqi
25/3 Joga Bai
Jamia Nagar
New Delhi-110025

پروین طلحہ
مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور

اللہ کی مرضی

شرافت اللہ ایک تانگے والا تھا۔ حسین آباد میں گھنٹہ گھر کے قریب اس کا گھر تھا۔ اس کے پُرکھے بھی اسی علاقے میں رہتے تھے اور گذر بسر کے لیے اسی کی طرح تانگہ چلاتے تھے۔ شرافت اللہ کو اپنے آبائی پیشے پر فخر تھا۔ ویسے فخر اس کو اپنے گھوڑے 'شیٹو' پر بھی تھا اس کا یقین تھا کہ شیٹو سے زیادہ تیز، پھرتیلا اور خوبصورت گھوڑا لکھنؤ میں دوسرا نہیں ہے، یہ غلط بھی نہیں تھا۔ بس تھوڑا سا مبالغہ تھا، وہ تو لکھنؤ والوں کی بات چیت میں مبالغے کی آمیزش ضروری ہے۔

شیٹو لمبا اور مضبوط جسامت کا گھوڑا تھا۔ شروع میں وہ گھوڑے کے سازوسامان اور چار تین وتوش کی سواریاں لے کر وہ ایک گھنٹے میں 12 میل کی رفتار سے دوڑتا تھا۔ شیٹو کی پوری زندگی شرافت اللہ اور اس کے خاندان کی کفالت میں گذری تھی۔ شرافت کے لیے وہ روزی کا اچھا ذریعہ تھا، اس کا پورا خاندان آرام سے پیٹ بھر کھانا کھاتا، اس کے دسترخوان پر صبح وشام گوشت ضرور ہوتا۔ ہفتے میں ایک بار صبح سویرے شرافت بازار جاتا اور واپسی میں اپنے ساتھ بہت سی جلیبیاں اور کیلے ضرور لاتا۔ اس کے بچوں کو ناشتے میں جلیبیاں بہت پسند تھیں اور شیٹو کیلے بہت شوق سے کھاتا تھا۔

شیٹو اچھی خوراک والا گھوڑا تھا۔ وہ روز پانی میں بھیگے ہوئے تین کلو چنے اور گٹھر بھر گھاس کھاتا تھا جو ایک گھسیارہ روز اس کے گھر پہنچا جاتا تھا۔ سردیوں میں گھی چپڑی روٹیاں کھاتا۔ شیٹو کو تر وتازہ رکھنے کے لیے اس کے جسم پر تیل کی مالش کرنا شرافت کا روز کا معمول تھا۔ شیٹو بھی شرافت کے کنبے کے دوسرے افراد کی طرح خوش اور مطمئن رہتا۔ شام کو شرافت اور شیٹو دن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب گھر واپس آتے شرافت شیٹو کو فوراً تانگے کے سازوسامان سے آزاد کر دیتا تب شیٹو اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اگلے دونوں پیر شرافت کے کاندھے پر رکھ دیتا اور خوب ہنہناتا۔ شیٹو کا شرافت کے کاندھے پر پیر رکھ کر کھڑا ہونا اور ہنہنانا، شرافت کی دن بھر کی تھکن اتار دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا ہنہنانا شرافت میں عجیب طرح کی تازگی بھر دیتا۔ شرافت کے پڑوسی اس کی زندگی پر رشک کرتے، یہ منظر دیکھنا سب کو بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ اللہ کی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے اظہار محبت تھا جو کسی زبان کا محتاج نہیں تھا۔

شرافت کے بچے بھی روز شام کو ان کے گرد کھڑے ہو کر یہ محبت بھرا منظر دیکھتے۔ انھیں بھی شیٹو کی محبت کا یہ انداز بہت اچھا لگتا، حالانکہ دونوں لڑکوں میں کوئی بھی اپنے باپ کے آبائی پیشے کو نہیں اپنانا چاہتا تھا، شرافت کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ لکھنؤ میں اب اس پیشے کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ آج شہر اپنی پہچان کی حد سے باہر پھیلتا جا رہا ہے۔ اب لکھنؤ اس کے بچپن کی طرح صرف حضرت گنج، چوک اور امین آباد تک محدود نہیں ہے جہاں مگر جہاں لوگ سال میں صرف ایک بار سنیوں کی کربلا میں تعزیوں کو دفنانے کے لیے جاتے تھے اور علی گنج میں جہاں بڑے منگل پر عقیدتمند بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے، اب وہاں بھی نئی کالونیاں بن گئی ہیں اور دولت مند لوگ وہاں رہتے ہیں اور تیز رفتار گاڑیاں وقت کی ضرورت بن چکی ہیں۔

''آنے والے دس سالوں میں تانگہ تو بالکل ختم ہو جائے گا۔''
شرافت نے سوچا مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ بڑے لوگوں میں تانگے کی

مقبولیت بہت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، نوجوان لڑکے تانگے پر بیٹھنے میں شرمندگی محسوس کرتے۔ شرافت اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا، مگر زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی رفتار پر اس کی نظر نہ تھی۔ یہ وہ تبدیلی تھی جس کی رفتار وقت سے بھی زیادہ تیز تھی۔ لکھنؤ کی سڑکوں پر اب رکشے تانگے کم نظر آتے تھے۔ سیکڑوں قسم کی کاریں، ٹیمپو، تھری وہیلر، بس اور ٹرک چل رہے تھے۔ چونکہ سڑکیں بہت سمٹ گئی تھیں، ہر طرف ناجائز قبضے تھے۔ اب ان سڑکوں پر تیز رفتار گاڑیوں کے ساتھ تانگہ چلانا آسان کام نہیں تھا۔ شرافت کی آمدنی ابھی تک اچھی خاصی تھی۔ جس کی خاص وجہ شیخو کی جسامت اور پھرتیلا پن تھا۔ خوبصورت سجا سجایا شان دار تانگا۔ شرافت اپنی مرضی کے راستوں پر چلنے کے لیے سواری کا انتخاب خود کرتا تھا، اس کی بات چیت کا انداز بہت دلچسپ تھا، وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن بہت شستہ اردو بولتا۔ اس کا بچپن تعلیم یافتہ خاندانوں کے درمیان گذرا جہاں اس کے باپ دادا کوچوان رہے تھے۔ اس کو صرف لکھنؤ کے نوابوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ طلسم ہوش ربا کے وہ قصے بھی یاد تھے جو اس کے دادا نے اسے رات کو بستر پر سونے سے پہلے سنائے تھے۔

شرافت کو اپنی تینوں لڑکیوں کے لیے اچھے لڑکے مل گئے اور ان کی شادیاں بھی بحسن وخوبی ہو گئیں دونوں لڑکوں کو کام پر بٹھا دیا تھا۔ ایک جوتے کے کارخانے میں کام کر رہا تھا اور دوسرا زردوزی کا کام سیکھ رہا تھا۔ شیخو کے لیے بھی شرافت کے ذہن میں کچھ منصوبے اور پروگرام تھے۔ وہ آنے والے دنوں میں اس سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ شیخو زندگی بھر تانگے میں جتا رہا تھا، اس لیے شرافت نے طے کیا تھا کہ جب شیخو کی عمر تیرہ سال ہو گی وہ اسے اس کام سے آزاد کر دے گا۔ وہ شیخو کو آرام سے بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ شیخو کو ہر بوجھ سے آزاد، گھر کے پیچھے والے جنگل میں چوکڑیاں بھرتا ہوا دیکھے۔

لیکن بہت جلد شرافت پر زندگی کی حقیقتیں عیاں ہو گئیں۔ پہلے تو وہ جنگل جس میں اس نے شیخو کے چوکڑیاں بھرنے کا خواب دیکھا تھا جنگل تو باقی رہا مگر یہ درختوں کا نہیں تھا بلکہ سیمنٹ اور پتھروں کا جنگل ہو گیا تھا۔

دوسری حقیقت اس پر اس طرح آشکارا ہوئی کہ اس نے شرافت کے پورے وجود کو ہلا دیا، جب شرافت کو یہ احساس ہوا کہ شیخو بارہ سال کا ہو گیا ہے اور چند ماہ میں تیرہ سال کا ہو جائے گا۔ اس دن شرافت ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ گھر واپس آیا بہت ناامید اور اکیلا، اس سے پہلے کبھی اس کا اعتماد اس طرح نہیں بکھرا تھا۔ وہ اپنے کو کوس رہا تھا کہ وہ بہت خود غرض آدمی ہے۔ شیخو تیرہ سال کا ہونے والا ہے اور اس نے اس کے لیے ابھی تک اتنا بھی پس انداز نہیں کیا کہ وہ ایک نو عمر گھوڑا خرید سکتا۔ اس نے شیخو کی ساری عمر کی کمائی خرچ کروا لی تھی۔ مگر شیخو کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ شرافت کے بیٹوں یونس اور یوسف نے اس کو پریشان دیکھ کر سوال کیا۔ ''ابا آپ کیوں پریشان ہیں۔'' تو اس نے اپنے دل کی پریشانی ان سے بیان کی۔

''ابا آپ پریشان نہ ہوں ایک مہینے بعد ہم لوگوں کو ہماری روزانہ کی مزدوری ملنا شروع ہو جائے گی، تب کوئی مسئلہ نہ ہو گا۔ آپ ایک نیا گھوڑا ایک سال میں خرید لیں گے۔'' بیٹوں کی اس بات سے شرافت کو بہت ڈھارس بندھی اور ناامیدی کی کیفیت سے باہر آنے میں مدد ملی۔

اگلا سال شیخو اور شرافت دونوں کے لیے اور زیادہ محنت کا تھا۔ شرافت کی بیوی گھر کے اخراجات بہت سلیقے سے چلاتی تھی اس نے تھوڑا بہت پیسہ جمع بھی کر لیا تھا لیکن یہ رقم اس لیے نہ تھی کہ ایک گھوڑا خریدا جائے بلکہ اپنے بیٹوں کی شادی کے لیے تھی، شرافت اور اس کی بیوی نے اندازہ لگایا تھا کہ دونوں بیٹے جلدی شادی کے خواہش مند ہیں اور اس وقت سمجھداری اسی میں تھی کہ شرافت شیخو اور اس کی بڑھتی عمر پر زور نہ دے۔ بھاری دل کے ساتھ شرافت نے شیخو کے ریٹائرمنٹ کا خیال ملتوی کر دیا۔

مگر ریٹائرمنٹ انتظار کر سکتا تھا شیخو کی بڑھتی ہوئی عمر نہیں۔ شرافت نے محسوس کیا تھا کہ اب شیخو میں وہ پہلے جیسی پھرتی نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہ عمر کے پندرہویں سال میں تھا اس کی ساری زندگی کڑی مشقت کرتے ہوئے گذری تھی۔ شرافت کو یہ سوچ کر جھرجھری آ جاتی کہ شیخو کی ماں گل بدن پندرہ سال کی ہو کر مر گئی تھی اور اس کے باپ اور دادا بھی تقریباً اتنی عمر تک ہی زندہ رہے تھے۔ ''اے اللہ میرے شیخو کو لمبی عمر اور اس دنیا میں کچھ وقت آرام کے لیے بھی دے دے۔ اس نے میرے لیے بے تکان کام کیا ہے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا۔'' شرافت کی ہر سانس میں اس کی زبان پر یہی دعا رہتی تھی۔

لیکن ضروری نہیں کہ ہر دعا کی قبولیت بھی انسان کی مرضی کے مطابق ہو۔

اللہ کا دعاؤں کی قبولیت کا انداز الگ بھی ہو سکتا ہے اور شرافت کی دعا اس طرح قبول ہوئی۔ شرافت نے سواریوں کو چوک میں گول دروازے تک چھوڑا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ گھر کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا کہ گھنٹہ گھر صاف نظر آ رہا تھا، اسی وقت پیچھے سے ایک تیز رفتار کار آئی اور تانگے کے پچھلے پہیے سے ٹکرائی۔ شیخو فٹ پاتھ کی طرف گر پڑا اور اس کے دونوں اگلے پیر بری طرح زخمی ہو گئے۔ یہ شرافت کے تمام عمر

کے منصوبوں کا خاتمہ تھا، تمام ارادے وہیں چکنا چور ہو گئے۔ چار مہینوں کے طویل عرصے کے بعد شینو اس لائق ہوا کہ اپنے چاروں پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ وہ اب چلنے میں لنگ کھانے لگا تھا، اور زیادہ تر اپنے سائبان کے نیچے کھڑا ہوا، گذرے ہوئے زمانے کی تصویر دکھائی دیتا۔

شینو کا بہترین علاج کروایا گیا۔ یہ علاج سرکاری مویشی اسپتال کے تجربہ کار کمپاؤنڈر کی مہربانی تھی، اس کا گھر شرافت کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شرافت اس کے بچوں کو کئی سال تک اسکول لے جاتا رہا تھا۔ شینو کی غذا کا بھی خیال رکھا گیا۔ بیٹوں کی شادی کے بعد شرافت کے پاس کچھ روپے بچ گئے تھے وہی خرچ ہو رہے تھے۔ مگر آگے کیا ہو گا کچھ معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد شرافت کے بڑے بیٹے یوسف نے کہا ''جب تک آپ کام شروع نہیں کرتے ہیں آپ اور اماں ہمارے اور یونس کے ساتھ کھانا کھایئے گا۔ آپ دونوں کو انشاء اللہ کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ لیکن ہماری مزدوری کتنی ہے آپ جانتے ہیں تین کلو چنا اور ایک گٹھر گھاس کا چارہ ہمارے بس کا نہیں ہے۔'' یونس اس کے قریب کھڑا اپنی بیوی کے ساتھ تائید میں سر ہلاتا رہا۔

''مجھے معلوم ہے بیٹا اسی لیے میں نے پہلے سے ایک سائیکل رکشہ طے کر لیا ہے۔ کل سے میں رکشہ چلاؤں گا۔ تم دونوں کو اپنے ماں باپ اور شینو کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

شرافت نے بڑے عزم اور حوصلے سے اگلے دن نیا کام شروع کر دیا۔ لیکن پہلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ تانگہ چلانے اور رکشہ کھینچنے میں بڑا فرق تھا تانگہ چلانے کے لیے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر لگام اپنے ہاتھ میں تھام کر کبھی کبھار چابک چلاتے ہوئے بھیڑ کے درمیان اپنا راستہ بنانا تھا اور رکشہ کھینچنے میں اس کا کام وہی تھا جو ابھی تک بے چارہ شینو اس کے لیے کرتا رہا تھا، یہ کام تو بالکل کولھو کے بیل کا تھا۔

ایک مہینے میں ہی شرافت کو بخار رہنے لگا اور کھانسی کی وجہ سے مجبوراً اس کو یہ کام چھوڑنا پڑا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا جو تھوڑا بہت کمایا تھا وہ رقم بھی شینو کے چارے پر تھوڑے دنوں میں خرچ ہو گئی۔ اب اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے اپنی کلائی کی گھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، وہ بھی چلی گئی۔ اس سے صرف چند ہی دنوں کا شینو کا چارہ آیا۔ اب تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

ایک دن اس کے بیٹے کام سے واپس آئے اور شرافت کو ایک اطلاع دی جس نے شرافت کی جان ہی نکال لی۔ انھوں نے بتایا ''آج ہمیں سرکاری محکمے جیسے پولیس اور کسٹم کے بارے میں پتہ چلا ہے جو گھوڑوں اور کتوں کو اپنے کام کے لیے پالتے ہیں۔ جب یہ جانور بوڑھے اور لاچار ہو جاتے ہیں تو ان کو گولی مار دی جاتی ہے۔ گورنمنٹ ان جانوروں پر پیسے خرچ نہیں کرتی ہے جو ان کے کام کے نہیں ہوتے ہیں۔'' یونس نے تفصیل سے بتایا۔

''تم لوگ یہ سب مجھ کو کیوں بتا رہے ہو۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ گورنمنٹ کے محکموں میں کس طرح کام ہوتا ہے۔'' شرافت نے غصے سے کہا۔

''ابا ناراض مت ہوں۔ آج اتفاق سے ایک ٹھیکیدار مل گیا تھا جو ایسے لاچار جانوروں کو نہ صرف سرکاری محکموں سے بلکہ لوگوں سے بھی خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے انھیں اچھی رقم بھی دیتا ہے۔'' یوسف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کل وہ آئے گا آپ سے بات کرنے کے لیے۔ اگر آپ کو سودا ٹھیک لگے تو آپ شینو کو ان کے حوالے کر دیجیے گا۔''

''ٹھیکیدار کو۔ ضرور'' شرافت غصے سے حلق میں آنسوؤں کے باوجود چیخا۔ ''اس قصائی کو میرے گھر بلانے کی ہمت بھی نہ کرنا۔ تم نے میرے بیٹے ہو کر، مجھے ایسا مشورہ کیسے دیا؟''

''میں نے تو یہ مشورہ شینو کی بہتری کے لیے دیا تھا۔ یونس اور میں بھی شینو سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جیسے آپ کرتے ہیں۔ ہم اسے بھوکا مرتے ہوئے تو نہیں دیکھ سکتے۔'' یوسف نے کہا اس کا خیال تھا اس کے ابا اس کی بات پر یقین کر لیں گے۔

''کیا تم لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے۔ اللہ اپنی اس مخلوق کو بھوکا کیوں رکھے گا جو ساری زندگی اس کے ایک بندے کے خاندان کے رزق کے لیے دوڑتا رہا ہو۔ کڑی مشقت کرتا رہا ہو، یہ کبھی مت سوچنا کہ میں تم دونوں میں کسی پر کبھی اپنی بیوی اور اپنے شینو کا بوجھ ڈالوں گا۔'' شرافت نے غصے سے کہا اور اپنی بوسیدہ کوٹھری سے باہر چلا گیا اور باہر جا کر بے اختیار رونے لگا۔ شینو تھوڑی دور زمین کے ایک حصے پر اگی گھاس چر رہا تھا، اچانک مڑا اور اپنے زخموں کے باوجود تیزی سے گھر کی طرف بھاگا اور بھاگتا ہوا اس طرف آیا جہاں شرافت کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں زخمی پاؤں اٹھائے اور اپنا منھ شرافت کے چہرے پر رگڑنے لگا۔ شرافت کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ زور سے ہنہنایا۔ ایسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا، اس کی آواز نہ صرف شرافت بلکہ ان پڑوسیوں کے دل کو چیر گئی جو شینو کی ہنہنانے کی درد اور بے بسی سے ڈوبی ہوئی آواز سن کر گھر سے باہر نکل آئے تھے۔

شرافت کا دل شینو کے برتاؤ اور رو لینے کے بعد تھوڑا ہلکا ہو گیا۔ وہ

شیخو کو اس کے سائبان میں لے گیا سائبان کی طرف جاتے ہوئے اس نے زور سے دوبارہ تیز آواز میں اپنے بیٹوں کو سنانے کے لیے کہا۔

''اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ وہ اپنے بندوں پر کرم کرنے میں دیر نہیں کرتا ہے۔ وہ میرے شیخو کو بھوکا نہیں رکھے گا، وہ مجھے اور میرے شیخو کو کسی پر بوجھ نہیں بننے دے گا، مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔''

اس رات شرافت خالی پیٹ ہی سو گیا گھر میں جو تھوڑے سے چنے تھے اس نے شیخو کے سامنے رکھ دیے۔ لیکن شیخو نے بھی ان کو نہ چھوا۔ اس رات شرافت اور اس کی بیوی شیخو کے سائبان میں ہی سوئے۔ ان کو اپنے لڑکوں کے ارادے بہت مشکوک لگے تھے۔ اب وہ ان پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ شیخو کے چارے کی اسے کوئی پروا نہ تھی۔ اسے اپنے اوپر بھروسہ تھا کہ شیخو کا پیٹ بھرنے کے لیے کمائی تو وہ کر ہی لے گا۔ لیکن ہاں اگر وہ مر گیا اور شیخو زندہ رہا تو اس بے چارے بے زبان جانور کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اتنی بڑی دنیا میں اسے ایک بھی آدمی ایسا نہیں دکھائی دے رہا تھا جس کو وہ شیخو کی ذمہ داری دے سکتا۔ شرافت رات بھر ایک پل کو بھی نہ سویا۔ وہ تکلیف دہ رات دھیرے دھیرے سویرے میں بدل گئی۔

صبح صبح جیسا کہ شرافت کا روز کا معمول تھا شیخو کے ساتھ چہل قدمی کو نکل گیا۔ شیخو کے ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ شیخو کو چلتا پھرتا رکھا جائے اور اس پر کوئی وزن نہ لادا جائے۔ ایک کلومیٹر کی دوری پر شرافت کے دوست کی کھانے کی دوکان تھی۔ شرافت کو اس سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ شیخو دور کھڑا تھا اس وقت اس کا دوست اکیلا تھا۔ ابھی بہت سویرا تھا اور گاہک آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔

شرافت نے سوچا اس سے ملازمت کی درخواست کرنے کا یہی مناسب وقت ہے۔ ''میں بہت اچھا کھانا پکانا جانتا ہوں۔ کھانا پکانا میں نے بچپن میں ان تعلقداروں کے یہاں سیکھا تھا جہاں میرے باپ دادا کام کرتے تھے۔'' یہ سچ بھی تھا۔ وہ بہترین شامی کباب اور پراٹھے بناتا تھا۔ جن سے خاص موقعوں پر کئی بار اس کے دوست بھی لطف اندوز ہو چکے تھے۔

''مجھے دوکان پر ایک مددگار کی ضرورت تو ہے لیکن میں اتنی تنخواہ نہ دے پاؤں گا جو تمہارے اتنے بڑے خاندان کے لیے کافی ہو'' اس کے دوست نے جواب دیا۔

''مجھے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میرے دونوں بیٹے کما رہے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی ہو گئی ہے۔ مجھے اب اتنا چاہیے کہ شیخو کو چارہ کھلا سکوں۔ اور اب اس کی خوراک آدھی بھی نہیں رہ گئی ہے۔ تمہاری بھابھی اور میرے لیے تو تمہاری دوکان کا بچا کھچا کھانا ہی کافی ہوگا۔'' شرافت نے کہا۔ ''پھر تو ٹھیک ہے۔'' اس کے دوست نے کہا۔

اسی وقت سامنے سے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے جو باپ اور بیٹے لگ رہے تھے، وہ سڑک سے انھیں کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں نے شیخو کی طرف دیکھا اور پوچھا ''یہ گھوڑا کس کا ہے۔''

''حضور میرا ہے'' شرافت بڑے فخر سے بولا۔ دونوں نے شرافت کی طرف دلچسپی سے دیکھا۔ ان دونوں میں سے بزرگ نے سوال کیا ''کیا تمہارا نام شرافت اللہ ہے۔''

''صحیح کہا حضور نے لیکن آپ کو اس غلام کا نام کیسے معلوم ہوا۔'' ''ہم تقریباً چھبیس سال پہلے تمہارے تانگے پر بیٹھ چکے ہیں۔ تمہارا نام تانگے پر لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تم جوان تھے، ہم نے تو تمھیں تمہارے گھوڑے سے پہچانا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''حضور چھبیس سال پہلے یہ گھوڑا میرا تانگہ نہیں کھینچتا تھا۔ بلکہ وہ اس کی ماں گلبدن تھی۔ اس وقت تو یہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ہو بہو اپنی ماں کی طرح ہے۔ حالانکہ قد میں یہ اس سے اونچا ہے۔''

''ہم نے اسے اس کے سفید رخ اور سیاہی مائل براؤن جسم کے رنگ سے پہچانا۔ کیونکہ اس طرح کے گھوڑے عام طور پر نظر نہیں آتے ہیں۔'' نوجوان آدمی نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں شرافت میاں یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ کسی کو آپ جیسا فرشتہ مل جائے۔ مگر ہم تو اتنے بدقسمت ہیں کہ جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکے۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔

''حضور آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں سمجھا نہیں۔'' شرافت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹے اس کی کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

وہ دونوں شرافت کو ایک طرف لے گئے اور اسے جون 1968 کی ایک گرم دوپہر کی یاد دلائی جب وہ اپنے تانگے پر حضرت گنج سے ایک ٹی بی کے ماہر ڈاکٹر کے مطب سے ان کو اکبری گیٹ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ آدھے گھنٹے سے سڑک پر رکشہ والے، تانگے والے ان کو لے جانے سے انکار کر رہے تھے۔ اس وقت بوڑھے کی عمر 37 سال تھی اور وہ بے چارہ دو چھوٹے لڑکوں کا باپ تھا۔ ایک لڑکا ٹی بی کا شکار تھا اور اس حالت میں تھا کہ باپ نے اسے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔ دوسرا لڑکا ساتھ تھا۔ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ بیمار

لڑکا ختم ہو گیا، پریشان اور دل برداشتہ باپ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یہ بات تانگے والے سے چھپائے رکھے، کیونکہ اگر اس کو یہ پتہ چل گیا کہ لڑکا ختم ہو گیا ہے تو وہ اس سے تانگہ خالی کرالے گا۔ اس آدمی کو بخوبی علم تھا کہ ریل اور سڑک کے تمام راستے اس بات کے پابند ہیں کہ راستے میں سواری پر ہونے والی موت کے بعد سواری کو خالی کرالیا جاتا ہے۔ اگر تانگے والا ان کو راستے میں اتار دیتا تو لاش گاڑی کا انتظام کرنے کے لیے ان کو سڑک پر لوگوں سے مدد مانگنا پڑتی تاکہ وہ پہلے اکبری گیٹ جائیں جہاں اس کی بیوی اپنے رشتے داروں کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ پھر سندیلے کے قریب اپنے گاؤں جائیں جہاں سے اپنے بیمار بیٹے کا علاج کرانے وہ لکھنؤ آئے تھے۔ اتنے بڑے دکھ اور مصیبت کے موقع پر اپنی حالت کو چھپانا اور آنسو روکنا خود ایک مشکل کام تھا۔

تانگے والے نے ایک لفظ منھ سے نکالے بغیر ان کو اکبری گیٹ تک پہنچا دیا۔ باپ اپنے بیٹے کے مردہ جسم کو بازوؤں میں لیے گھر میں گھسا۔ اس کا دوسرا بیٹا ایک کپڑے کے تھیلے میں دوائیں لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ دونوں اور بچے کی ماں بے قرار ہو کر رو رہے تھے۔ باپ اور اس کے بیٹے کو تانگے والے کا خیال اس وقت آیا جب انھیں اپنے تھیلے میں دوا کی بوتل میں ربر بینڈ سے بندھا ہوا سو روپے کا ایک نوٹ ملا۔ بیٹے نے وہ نوٹ باپ کو دکھایا اور بتایا کہ وہ پہلے تو خالی ہاتھ دروازے کی طرف لپکا تھا۔ مگر پھر اسے تھیلے اور نئی خریدی ہوئی دواؤں کا خیال آیا اور وہ تانگے کی طرف تھیلا لینے واپس آ گیا۔ تانگے والے نے اسے دواؤں کا تھیلا پکڑا دیا تھا۔ باپ بیٹے دونوں کو یقین تھا کہ تانگے والے نے ہی اس وقت یہ نوٹ تھیلے میں ڈالا تھا۔ شاید تانگے والے کو ان کی مالی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سو روپے کے اس نوٹ نے نہ صرف ان کو بے عزتی کی اذیت سے بچایا تھا بلکہ ان کے بیٹے کی تجہیز و تکفین کی آخری رسوم بھی باعزت طریقے سے پوری ہو سکی تھیں۔

یہ کہانی سن کر شرافت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جو اسے کچھ کچھ یاد تھی مگر تفصیل بھول چکا تھا۔ شرافت نے آنکھیں پونچھیں باپ بیٹے کو تسلی دی جن کے لیے 1968 کا وہ تکلیف دہ دن آج پھر طلوع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے ڈھابے سے دونوں کو ٹھنڈا شربت پلایا۔ اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے اس نے ان دونوں سے کسی وقت اپنے گھر آنے کی درخواست کی۔

بہت دنوں کا بھولا ہوا وہ تکلیف دہ دن شرافت کو پھر یاد آ گیا جب وہ اپنے لیے نیا تانگا خریدنے کے لیے جا رہا تھا اور اس واقعہ کی مصیبت میں جتلا باپ اور بیٹے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ورنہ سو روپے کا نوٹ اس طرح اس کی جیب میں کبھی نہ رہتا تھا اسے یاد آیا کہ ان تینوں کی بے بسی نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ تانگے والے کی دوکان جانے کا اپنا ارادہ اس وقت ملتوی کر دے۔ تانگہ بنانے والے مستری نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ پرانے تانگے اور سو روپے کے بدلے میں وہ اسے نیا تانگہ دے گا حالانکہ پھر اس کے بعد دوسرا تانگا خریدنے میں اسے دس سال لگ گئے تھے مگر اسے اس کا کبھی ملال نہیں ہوا تھا اور یہ واقعہ بھی دوبارہ اس کے ذہن میں کبھی نہ آیا لیکن ایک بیمار بچے کی موت کا وہ لمحہ اس کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہا۔ کیونکہ باپ کے جاننے سے پہلے شرافت بچے کی موت کا منظر اپنے سامنے تانگے میں لگے آئینے میں دیکھ چکا تھا۔

اسے خوشی ہوئی کہ اس کی وجہ سے ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ مگر یہ بات اس کے لیے زیادہ خوش کن تھی کہ ان لوگوں نے اسے بھلایا نہیں تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس دنیا میں اچھے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں یہاں صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اپنے فائدے کے لیے بے بس اور لاچار جانوروں کو ختم کر دیتے ہیں، اسی شام وہ دونوں باپ بیٹے اس کے گھر بہت سے سامان اور ایک بوری چنے کے ساتھ آئے۔ وہ لوگ شرافت سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے بہت پرانے ملنے والے ہوں۔ انھوں نے شرافت سے بتایا کہ ان کے لیے وقت کس طرح تبدیل ہوا ہے۔ اس تکلیف دہ واقعہ کے بعد باپ جو ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا اس نے اپنے دوسرے بیٹے کی تعلیم کی طرف بہت توجہ دی۔ خوش قسمتی سے لڑکا بہت ذہین تھا، اس کو پڑھائی میں بہت سے وظیفے ملے اور ایک مددگار دریا دل شخص نے اسے میڈیکل کی تعلیم کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ ہندوستان واپسی پر اس کی ڈاکٹری کی پریکٹس بہت اچھی چلنے لگی بہت جلد انھوں نے لکھنؤ اور اپنے گاؤں میں ایک اسپتال کھولا جہاں اب وہ گاؤں کے لوگوں کا مفت علاج کرتا تھا۔

باپ اور بیٹے دونوں نے شرافت سے بہت درخواست کی وہ کچھ رقم قبول کر لے اور ایک نو عمر گھوڑا خرید لے یا کھانے کا ایک ڈھابہ کھول لے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ اسپتال میں ملازمت کے لیے بھی راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا "میں بالکل ان پڑھ ہوں میں آپ کے اسپتال کے لیے کیا کام کروں گا۔"

شرافت کے دل پر ان لوگوں کی محبت اور احسان مندی کا بہت اثر ہوا تھا کہ وہ باپ بیٹے کس دردمندی سے اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ان سے کوئی مدد لینے کے لیے راضی نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ رقم اس

چھوٹی سی مدد کی اجرت ہو جاتی جو اس نے اتفاقاً کی تھی۔ ''اللہ مجھے معاف کرے اگر میں کبھی کسی کی مدد کسی بدلے کی توقع پر کروں۔'' شرافت نے دل ہی دل میں سوچا پھر بزرگ کی طرف مڑ کر بولا۔ ''حضور آپ کی مہربانیاں اور دعائیں میرے ساتھ ہیں یہی میرے لیے بہت ہے۔''

اس بزرگ نے شرافت کے سر پر ہاتھ رکھا اسے دعائیں دیں اور چلنے کے لیے مڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سڑک تک، جہاں ان کی کار کھڑی تھی پہنچتے، وہ پلٹے اور پھر شرافت کے سامنے آ کر رک گئے'' کیا ہم شیخو کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟'' شرافت کے چہرے پر ایک چمک سی آئی اس نے کہا ''ہاں۔ ڈاکٹر صاحب'' اس بار شرافت بیٹے سے بات کر رہا تھا اور دونوں باپ بیٹے امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ''آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔ خدا کرے آپ اس دنیا میں میرے بعد بہت دن رہیں، آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ اگر میں شیخو سے پہلے ختم ہو جاؤں تو آپ میرے شیخو کی دیکھ بھال محبت سے کریں گے۔''

بیٹے نے شدت جذبات میں شرافت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور محبت سے چومے، اپنی آنکھوں سے لگا لیے اور بولا ''شرافت بھائی میں وعدہ کرتا ہوں کہ شیخو آج سے میری اولاد کی طرح ہے۔ خدا نے مجھے دو بچے پہلے سے دیے ہیں۔ آج اس نے مجھے تیسرا دیا ہے۔'' شرافت کو محسوس ہوا کہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے سمجھ کر کہا ہے۔

شرافت کے لڑکے قریب کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان کو مخاطب کرتے ہوئے شرافت نے کہا۔

''کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ اللہ بڑا مددگار ہے۔ اس کی مدد میں دیر نہیں لگتی۔''

(ماخوذ از فدائے لکھنؤ' قومی اردو کونسل)

فرہنگ آصفیہ

بقراط۔ یونانی۔ اسم مذکر (صحیح بفتح موحدہ اور زبان زد خاص و عام بضم موحدہ)۔ ( ) جس شخص نے فن طب سے بخل اٹھا کر اسے عام کر دیا وہ یہی بقراط طبیب ہے اس کے زمانہ کی نسبت اختلاف ہے۔ روضۃ الصفا والا لکھتا ہے کہ بقراط اور ذی مقراطیس یہ دونوں بہمن واسفندیار کے زمانہ میں تھے۔ دیگر مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ بقراط سکندر رومی سے سو برس پہلے گزرا ہے۔ تاریخ الحکما والے نے ارسطا طالیس کے بعد اس کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ بقراط بن راقیس اس قلیبوس ثانی کے شاگردوں اور اسی کی اولاد میں ہے جس شخص نے اول فن طب وضع کر کے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ غیروں اور پردیسیوں کو یہ علم ہر گز نہ سکھانا تا کہ ہمارے خاندان کی بات بنی رہے وہ یہی اسقلیبوس تھا۔ اس حکیم کی رائے اس فن میں صرف تجربہ پر موقوف تھی۔ مگر جب بقراط نے تجربہ اور قیاس کو بچشم غور دیکھ کر اس امر کا تصفیہ کیا تو دونوں کو لازم ملزوم پایا اور کہا کہ تجربہ قیاس کے بغیر خطرناک ہے۔ اور قیاس تجربہ بغیر مستلزم ہلاکت۔ غرض اس نے لازمی طور پر قیاس کو شامل تجربہ کر دیا اور ان تینوں طبیبوں کی کتابیں جلا دینے کا حکم دیا۔ ہاں متقدمین کی وہ کتابیں جو تجربہ اور قیاس پر مبنی تھیں انہیں برابر جاری اور قابل اعتماد سمجھا۔ بلکہ جب اسقلیبوس اور اس کے شاگرد جو اس امر میں بقراط کے مخالف تھے اس دنیا سے چل بسے تو اس نے مسند طبابت پر اجلاس فرمایا۔ اس کے وقت میں صنعت تجربہ نے بڑا زور پکڑا۔ جس وقت اس نے دیکھا کہ پردیسیوں اور بیگانوں کی ممانعت کے سبب اس فن میں نقصان اور ضعف آتا چلا ہے تو تمام مسائل طبی کو کتابی طور پر جمع کر کے پردیسیوں۔ اجنبیوں اور عام لوگوں کو اجازت دے دی اور اولاد کو وصیت کر دی کہ اصحاب زکا و فطنت سے ہر گز ہر گز اس فن کے بتانے میں دریغ ومضائقہ نہ کرنا۔ چنانچہ بقراط کی اس رائے صائب وفکر جمیل کی برکت سے یہ شریف فن خلق میں پھیل گیا۔ بقراط حکیم کم رفتار کم خواب کم گو۔ اور اکثر روزہ دار تھا۔ ہر وقت سر جھکا رکھتا اور بے سوچے کوئی بات نہ کہتا تھا۔ برس زندہ رہا۔ سولہ برس تحصیل علم میں، تصنیف وتدریس وعبادت الٰہی میں صرف کئے۔ اس حکیم نے پانچ انچھروں میں ساری طب ختم کر دی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر مادۂ فاسد سر میں ہو تو غرغرہ کرائیں اور جو فم معدہ میں تو قے علیٰ ہذا اگر خاص معدے میں ہو تو مسہل دیں اور جو جلد میں تو عرق یعنی پسینہ لیں اور عروق یعنی رگوں میں پایا جائے تو فصد کھلوائیں۔ اس کا قول ہے کہ چار چیزیں نور باصرہ کو نقصان پہنچاتی ہیں گرم کھانا۔ جلتا پانی سر پر ڈالنا سورج کو تکتے رہنا۔ دشمن کی جانب نظر کرنا۔ یہی کہتا ہے کہ تین چیز آدمی کو دبلا کرتی ہیں۔ نہار منہ پانی پینا۔ سخت زمین پر سونا۔ چیخ چیخ کر بہت بولنا۔ اسی کا قول ہے چار چیزوں سے بدن خراب ہوتا ہے۔ نہار منہ حمام سے۔ خالی یا بھرے معدے جماع سے۔ خشک گوشت کھانا اور نہار منہ پانی پینا بھی یہی اثر رکھتا ہے۔ بیمار کو جس چیز کی رغبت ہو اس کا دینا بے رغبت چیز کھلانے سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ بہمن بن اسفندیار نے بقراط کو نہایت شوق سے بلایا۔ بڑا اشرفیاں بھیجیں اور کہا کہ یہ لیجئے اور تشریف لائیے مگر بقراط نہ گیا۔ اشرفیاں واپس کر دیں اور یہ جواب دیا کہ میں علم و فضل کو مال کی عوض بیچنے والا نہیں ہوں (۔ ا) جگادری۔ بڑا بھاری۔ نہایت ہوشیار اور عقلمند۔ بھاری بھر کم آدمی۔

نظم

رشتہ

ناہید خانم

میں نے اٹھلاتی ہوئی موجوں سے پوچھا ایک دن
موجِ سرکش بتا
ساحل سے کیا رشتہ ترا
مسکرا کر یہ جواب آیا سمندر سے مجھے
میرا ساحل سے بھلا رشتہ ہے کیا
روز جاتی ہوں
اسے چھوتی ہوں
لوٹ آتی ہوں میں
اس نے کب اپنا مجھے جانا کبھی
اپنی باہوں میں کہاں تھاما کبھی
میں پناہوں کو ترستی ہی رہی
اس نے پیاسا ہی تو لوٹایا مجھے
کیا بتاؤں تجھ کو ساحل سے ہے کیا رشتہ مرا
ملنا اور مل کر بچھڑ جانا
مقدر میں لکھا

سمیرہ عزیز (سعودی عرب)

غزل

ایک دن یہ در و دیوار کھلیں گے مجھ پر
دل کی بستی کے سب اسرار کھلیں گے مجھ پر

بند کمرے میں مجھے رونا ہے اس روز بہت
جب کبھی میرے وفادار کھلیں گے مجھ پر

پہلا ترکش مرے اپنوں کی زبانیں ہوں گی
پھر پرائے لب اظہار کھلیں گے مجھ پر

میں کہ عورت ہوں گنہ ہے یہی پہلا میرا
سو کئی تیر لگاتار کھلیں گے مجھ پر

داد و بے داد کی کیا فکر سمیرہ مجھ کو
یہ بہت ہے میرے اشعار کھلیں گے مجھ پر

حسن سخن

غزلیں

صاحبہ شہریار

یاد کیوں آتا ہے ہر بار وہ منظر مجھ کو
اپنی لہروں میں چھپاتا تھا سمندر مجھ کو

اس کے چہرے کو بھی پہچان نہیں پائی میں
میرا اپنا بھی پرایا سا لگا گھر مجھ کو

دیکھنا کوئی بھی لمحہ نہ سکوں پائے گا
زندگی گزرے گی کیسے تری ٹھوکر مجھ کو

میں کسی حال میں بھی بھول نہیں سکتی اسے
میرا ماضی ہے یہ یاد آئے گا اکثر مجھ کو

دل میں جب یورشِ غم سے ہو پریشانی سی
ایسے لمحوں میں کبھی دیکھنا چھو کر مجھ کو

صاحبہ آج بڑے شوق سے لہراتا ہے
دل کا ہر زخم جو کہتا تھا کبھی ہر مجھ کو

ہوا کو ضد ہے کہ پھولوں کو ساتھ لے لوں گی
مجھے یہ ضد کہ بکھرنے سے اُن کو روکوں گی

میں جانتی ہوں جو انسانیت کی قدریں ہیں
کسی کا درد بھی ہو اپنے دل میں پالوں گی

دیا یہ میرا جو زد پہ ہوا کی رکھا ہے
کسی بھی حال میں بجھنے سے میں بچالوں گی

جو آنے والی ہیں نسلیں وہ اس پہ ناز کریں
میں ایسے سانچے میں اس زندگی کو ڈھالوں گی

یہ رسم اُس کی ہے جگنو کو بس مٹا دینا
رہوں گی سانسوں میں اس کی اُسے بچالوں گی

جہاں میں صاحبہ سب لوگ مل کے ساتھ رہیں
جہاں میں جینے کے وہ راستے نکالوں گی

Sahiba Sheheryar
4P, Sector-1, J.D.A. Housing
Roop Nagar, Jammu-180013

لذیذ پکوان

قورمہ

اجزا: گوشت آدھا کلو، پیاز چار سے پانچ عدد درمیانے سائز کی، ادرک ایک انچ کا ٹکڑا، لہسن پسا ہوا ایک ٹیبل سپون، سفید زیرہ آدھا چائے کا چمچ، ثابت کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، سبز الائچی سات عدد، بڑی الائچی دو عدد، تیز پات ایک سے دو، لونگ پانچ عدد، دار چینی دو سے تین ٹکڑے، جائفل جاوتری تھوڑی سی، لال پسی مرچ، نمک حسب ذائقہ، دھنیا پاؤڈر دو کھانے کے چمچ، دہی آدھا کلو، تیل گھی ڈیپ فرائنگ کے لیے، کیوڑہ چند قطرے

ترکیب: ایک دیگچی میں آدھا کپ گھی گرم کریں۔ اس میں گوشت ڈالیں۔ اب اس میں نمک، پسی مرچ، دھنیا پاؤڈر، لہسن، لونگ، سبز الائچی، کالی مرچ ڈالیں۔ زیرہ کو ہلکی سے چوٹ مار کر اس میں شامل کریں۔ ادرک کے لچھے کر کے شامل کریں اور گوشت میں ملا دیں۔ اب اس میں حسب ضرورت پانی شامل کر کے گلنے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں دہی شامل کر کے بھون لیں۔ اسی دوران پیاز کے لچھے کاٹ کر اسے ڈیپ فرائی کر لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر باہر نکال کر ہوا میں رکھ دیں۔ جب چر چری ہو جائے تو اسے ہاتھوں سے مل کر چورا بنا لیں۔ اسے قورمے میں شامل کریں۔ ایک کپ کے قریب پانی شامل کریں۔ بڑی الائچی کو باریک پیس کر چھڑک دیں اور آدھے سے ایک گھنٹہ دم دیں۔ قورمہ تیار ہے۔

کھلے برتن میں تیل ڈال کر گاجریں اور بند گوبھی فرائی کر لیں۔ دوسری طرف ایک اور پین میں انڈے فرائی کر کے کچومر بنا لیں، پھر ان میں نمک، کالی مرچ اور چکن پاؤڈر شامل کر کے اُبلے ہوئے چاول ڈال دیں اور چمچ کا استعمال کرنے کی بجائے چاولوں کو اچھال کر اس طرح ہلائیں کہ تمام اجزا چاولوں میں مکس ہو جائیں۔ آخر میں چاولوں پر ہری پیاز سے گارنشنگ کریں اور مزے دار ایگ فرائیڈ رائس سے لطف اندوز ہوں۔

چٹ پٹا چکن

اجزا: 4 ٹکڑے کر لیں، نمک حسب ذائقہ، ادرک لہسن پیسٹ، ایک بڑا چمچ ہلدی پاؤڈر 1/2 چمچ، لال مرچ پاؤڈر حسب ذائقہ، کالی مرچ 2 چٹکی، لیموں 2 عدد رس نکال لیں، مایونیز 1 بڑا چمچ، چکن مصالحہ 1/2 چائے کا چمچ گرم مصالحہ پاؤڈر حسب ذائقہ، تیل 1 بڑا چمچ

ترکیب: مرغ کو دھو کر، لیموں کے رس میں نمک، لال مرچ، ادرک لہسن پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، کالی مرچ پاؤڈر، چکن مسالا، گرم مصالحہ پاؤڈر اچھی طرح مکس کر کے پیسٹ بنا لیں پھر اس پیسٹ کو چکن پر لگائیں، اب

چکن کو کسی بڑے برتن میں رکھیں اور اوپر سے میونیز اور تیل ڈال کر 5 منٹ تیز آنچ پر پھر دھیمی آنچ پر پکنے کے لیے چھوڑ دیں، جب گوشت ایک طرف سے سرخ ہو جائے تو چمچ سے احتیاط کے ساتھ دوسری طرف پلٹ کر سرخ کر لیں۔ چٹ پٹا مرغ تیار ہے۔

ٹریڈیشنل پراٹھا

اجزا: آٹا 250 گرام، پانی حسب ضرورت، نمک ایک چٹکی، گھی حسب ضرورت۔

ترکیب: آٹے کو نیم گرم پانی سے گوندھ لیں۔ اب اس گندھے ہوئے آٹے کے 6 یکساں حصے کر کے ہر پیڑے کو پانچ انچ کی گولائی میں بیل لیں۔ اب اس کے اوپر ایک چائے کا چمچ گھی لگا کر اسے دوہرا کر کے

موڑ لیں، ایسے کہ نیم دائرہ بن جائے۔ اب اس کے اوپر بھی تھوڑا سا گھی لگا کر دائیں سے موڑ دیں اور پھر بائیں سے موڑ کر اسے ہاتھوں کی مدد سے کھینچ کر لمبا رول بنا لیں۔ اب اس رول کو لپیٹ کر گول کر لیں اور انگلیوں سے دبا کر چپٹا کر لیں۔ بیلن کی مدد سے بیل کر 5 انچ گولائی دیں۔ توے کو درمیانی آنچ پر گرم کر کے اس کے اوپر پراٹھا ڈال دیں۔ جب نچلی سطح ذرا خستہ اور ہلکی پک جائے تو اسے پلٹ دیں۔ اب اوپری حصے پر گھی لگائیں، نچلے حصے پر گولڈن براؤن اور خستہ ہونے تک تلیں۔ گرما گرم پراٹھوں کو فوراً پیش کریں۔

گاجر کا زردہ

اجزا: چاول آدھا کلو (ابلے ہوئے)، گاجر کش کی ہوئی تین عدد، چینی آدھا کلو، دودھ آدھی پیالی، کھویا آدھی پیالی، پستے آدھی پیالی، ناریل حسب پسند (کش کیا ہوا) کوکنگ آئل آدھی پیالی۔

ترکیب: گاجر کو فرائنگ پین میں پھیلا کر رکھیں اور درمیانی آنچ پر پکاتے ہوئے اس کا پانی خشک کر لیں۔ چاول، گاجر اور چینی کو دو حصوں میں تقسیم کریں۔ پھر ایک پین میں دو سے تین کھانے کے چمچ تیل ڈالیں

اب اس میں ایک تہہ چاول ایک گاجر اور چینی کے اوپر دو کھانے کے چمچ دودھ ڈالیں اور پھر اسی عمل کو دوبارہ دہرائیں۔ پین کو توے پر رکھ کر شروع میں تین سے چار منٹ آنچ درمیانی رکھیں اور پھر ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ دم پر رکھ دیں۔ چولہے سے اتار کر اس میں کوکنگ آئل ڈال کر پانچ منٹ ڈھک کر رکھیں۔ اچھی طرح ڈش کو نکالیں اور ناریل پستے اور کھویا چھڑک دیں۔ گرما گرم گاجر کا زردہ تیار ہے۔

چکن سلاد سینڈوچ

اجزا: چکن بریسٹ سلائس چار عدد، سلاد کے پتے چار عدد، ڈبل روٹی کے سلائس آٹھ عدد، ٹماٹر ایک عدد، مایونیز آدھا کپ، نمک حسب ضرورت، کالی مرچ حسب ضرورت

ترکیب: چکن بریسٹ پر نمک اور کالی مرچ لگا کے اوون میں دس منٹ سینک لیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس دونوں اطراف سے سینک کر ان پر مایونیز بھی لگا دیں۔ چار سلائس پر سلاد کے پتے رکھ کر اس کے اوپر چکن اور ٹماٹر رکھنے کے بعد بقیہ چاروں سلائس ہر ایک پر رکھ کر سینڈوچ بنا لیں۔ اب درمیان سے اس طرح کاٹیں کہ تکونی شکل بن جائے۔ فرنچ فرائز اور کیچپ کے ساتھ نوش کریں۔

سبز چائے: فائدے اور استعمال

انصاری اسماء

چائے دنیا بھر میں پانی کے بعد لوگوں کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ہر دلعزیز مشروب ہے۔ ہر روز دنیا بھر میں کروڑوں لوگ چائے سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن آج کل سبز چائے کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی چائے ہے جو کہ عام چائےOolong Tea & BlackTea سے مختلف ہوتی ہے۔ عام چائے بنانے کے لیے اس کے پتوں کو سکھا کر عمل تکسید (Oxidation) کیا جاتا ہے۔ سبز چائےCamellia Sinensis پودے کی پتیوں سے بنائی جاتی ہے۔

سبز چائے کی قسمیں: مندرجہ ذیل عوامل کی بنا پر سبز چائے کی الگ الگ اقسام ہوتی ہیں۔

i- سبز چائے میںC-sinensis پودے کی اقسام
ii- پودے کی نشو ونما کا ماحول
iii- پودوں کی باغبانی کا طریقہ
iv- پودوں کی کٹائی کا وقت
v- سبز چائے بنانے کا عمل

سبز چائے کی ابتدا یوں تو چین سے ہوئی لیکن ایشائی ممالک میں بھی اب سبز چائے کی پیداوار بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ چین صدیوں سے اسے استعمال کرتا چلا آیا ہے۔ وہاں دواؤوں کے ماہرین اسے استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ہندوستان عام چائے کی پیداوار میں دوسرے مقام پر ہے۔ جبکہ چین ایک نمبر پر ہے۔ لیکن 2013 کے مطابق ہندوستان میں سبز چائے کی کھپت ہر سال 50% سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر چائے پیدا کرنے والی ریاستیں آسام، مغربی بنگال، تامل ناڈو، کیرالا، تری پورہ، اروناچل پردیش، ہماچل پردیش، کرناٹک، ناگالینڈ، اتراکھنڈ، منی پور، میزورم، میگھالیہ، بہار، اڑیسہ ہیں۔

سبز چائے کے فوائد کے بارے میں آگاہی میں اضافے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے اپنی خوراک میں شامل کر رہے ہیں۔ سبز چائے کی خصوصیات کو کئی ممالک نے تسلیم کیا ہے۔ ماہرین صحت مند مشروب کے طور پر زندگی کو پر جوش بنانے کے لیے سبز چائے پینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ بعد ازاں سبز چائے اس قابل ہے کہ یہ آپ کی صحت کا احاطہ کرکے آپ کو اعلیٰ قسم کے فوائد سے مستفیض کرتی ہے۔

سبز چائے کے فوائد:

ذیابیطس اور دل کے امراض کے لیے مفید:

سبز چائے میں فلاوو نائڈزFLavonoids اور اینٹی آکسیڈنٹ Antioxidant کی تعداد کافی زیادہ ہوتی ہے جو خراب کولیسٹرول کے اثرات کو کم کرتے، خون کے لوتھڑوں کی روک تھام اور شریانوں کے افعال میں بہتری لاتے ہیں۔ سبز چائے انجائنا اور ذیابیطس کو کافی حد تک کنٹرول کرتی ہے اور خون میں کولیسٹرول میں اضافے کے خلاف ایک مستحکم اور مضبوط دفاعی نظام فراہم کرتی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق

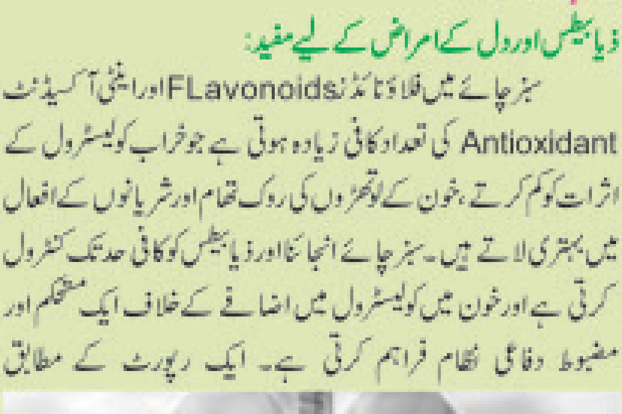

روزانہ 1 سے 2 کپ سبز چائے پینے والوں میں شریانوں کے سکڑنے کا خطرہ 45% تک کم ہو جاتا ہے۔

دماغ کے لیے مفید:

نیدرلینڈ کے محققین نے ایک حالیہ تحقیق میں تصدیق کی ہے کہ سبز چائے کے دو اجزا (Thiamine) تھیامائن اور (Caffeine) کیفین توجہ اور ہوشیاری کی سطح میں نمایاں اضافہ کرتے ہیں۔ توانائی بخش دیگر مشروبات کے مقابلے میں سبز چائے کے استعمال سے اعصابی تناؤ اور خلجان جیسی کیفیات میں مبتلا ہونے کا امکان کم ہوتا ہے۔ سبز چائے بے چینی اور مخالف جذبات کو اطمینان بخش بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

چونکہ اس میں کیفین کی مقدار کم ہوتی ہے اس لیے American Journal of Clinical Nutrition میں شائع ایک تحقیق کے مطابق روزانہ 1 کپ سبز چائے کے استعمال سے 55 سال سے زائد عمر کے لوگوں میں ذہنی صلاحیتوں کی تنزلی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ اینٹی آکسیڈنٹ مرکبات Catechin کی موجودگی کے ساتھ سبز چائے عمر سے متعلق قوت حافظہ کی حفاظت اور الزائمر (Alzheimers) پارکنسنز (Parkinson) جیسی بیماریوں کے خطرات سے کافی حد تک بچاؤ میں مدد کرتی ہے اور دماغ کے عصبی نظام کو متحرک کرتی ہے۔

ذہنی تناؤ میں کمی:

سبز چائے میں کیفین کی مقدار کم ہوتی ہے اور اس کے 5 کپ کا استعمال ممکنہ طور پر نفسیاتی دباؤ میں کمی لا سکتا ہے۔ یہ بات جاپان کی ایک یونیورسٹی کی حالیہ تحقیق میں سامنے آئی۔ محققین اس کے لیے کسی مخصوص جز کی نشاندہی تو نہیں کر سکے تاہم جانوروں پر تجربات کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ یہ مشروب جسم میں تناؤ کا باعث بننے والے کیمیکلز کی مقدار کو کم کر دیتا ہے۔

کینسر کے بڑھتے خطرات میں کمی:

محققین کے مطابق سبز چائے میں موجود پولیفینولز (Polyphenols) نامی جز اور Epigallocatechin gallate (EGCG) کی موجودگی کے ساتھ کینسر کے خلیات کو مارنے اور ان کی پیش قدمی کو روکنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ سبز چائے کا استعمال کرنے والی خواتین میں علاج کے بعد بریسٹ کینسر کے لوٹنے کا امکان کم ہوتا ہے جبکہ سبز چائے کو آنتوں کے کینسر کا خطرہ 30 فیصد تک کم کرنے کے لیے بہترین بتایا گیا ہے۔ روزانہ ایک کپ سبز چائے جسم کو قدرتی طور پر مضبوط اور دفاعی نظام کو بہتر بناتا ہے اور کینسر کے بڑھتے ہوئے خطرات کو روکتا ہے جو پیٹ کا کینسر، بریسٹ کینسر، پھیپھڑے کا کینسر اور بڑی آنت کے کینسر سے منسلک ہے۔

جوڑوں کے درد کے لیے بہترین:

خارش اور درد کی روک تھام کے لیے روزانہ چار کپ سبز چائے پینا شروع کر دیں۔ امریکہ کی Western Reserve University کی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ سبز چائے میں موجود کیمیائی مرکبات انسداد سوجن اور اینٹی آکسیڈنٹ کا کام کرتے ہیں جس سے جوڑوں کے امراض کا خطرہ چائے سے دور بھاگنے والوں کے مقابلے میں 60% کم ہو جاتا ہے۔

دمہ میں فائدہ مند:

روزانہ 2 کپ سبز چائے کا استعمال دمہ سے بچاؤ میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ سبز چائے میں موجود اینٹی آکسیڈنٹ الرجک ردعمل کا باعث بنتے ہیں اور دمہ سے بچاؤ کے لیے دی جانے والی ادویات جیسی کارکردگی انجام دیتی ہیں۔

میٹابولک ایکشن کے ذریعے چربی جلانا:

ماہرین کا کہنا ہے کہ سبز چائے موٹاپا کم کرنے کے عمل میں جسم کے

میٹابولک سسٹم کے ذریعے سہولت فراہم کرتی ہے۔ سبز چائے میں بڑی مقدار میں ایسے قدرتی اجزا پائے جاتے ہیں جن سے جسم میں اضافی چربی بننا کم ہو جاتی ہے۔ ہر انسان کے موٹاپے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے لیکن سبز

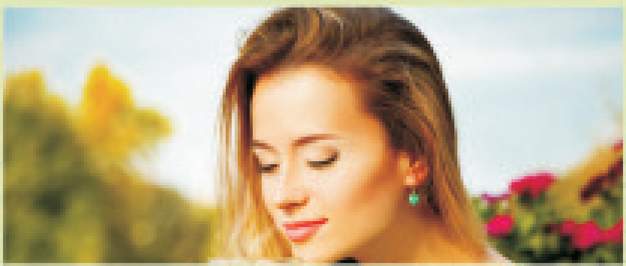

چائے صورتحال کے مطابق کارکردگی انجام دیتی ہے۔ نیز اس میں موجود فیٹی ایسڈز جسم کی کارکردگی کو بڑھاتے ہیں۔

آنکھوں کے لیے فائدہ مند:

کچھ ماہرین کا دعویٰ ہے کہ سبز چائے آنکھوں کے لیے بھی مفید ہے۔ ٹی بیگ کو گیلا کرکے آنکھوں پر پندرہ سے بیس منٹ تک رکھ لیا جائے تو اس سے تھکی ہوئی یا سوجی ہوئی آنکھوں کو سکون ملتا ہے اور وہ تازہ دم ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ موتیا کی بیماری کا خطرہ بھی دور ہوتا ہے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی کم ہو جاتے ہیں۔

الرجی سے راحت:

سبز چائے فلاوونائڈز (Flavonoids) یعنی نباتاتی کیمیکلز سے بھرپور ہوتی ہے جو سوجن اور الرجی سے تحفظ دیتے ہیں۔ ہر روز کچھ کپ اس مشروب کے استعمال سے الرجیز سے راحت ملتی ہے۔

پیشاب کی نالی میں انفیکشن کے خلاف جدوجہد:

مختلف طبی تحقیقی رپورٹس کے مطابق 2 سے 3 کپ سبز چائے کا روزانہ استعمال پیشاب کی نالی کے انفیکشن کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس چائے میں موجود اینٹی آکسیڈنٹ مثانے کی سوجن کو کم کرتے ہیں۔

مہاسوں سے خطاب:

میاجی یونیورسٹی کی ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ سبز چائے میں شامل اینٹی آکسیڈنٹ اجزا دو تہائی کیل مہاسوں کو صاف کر دیتے ہیں۔ تاہم اس کے لیے چائے کو پینے کی بجائے ٹھنڈا کرکے فیس واش کے طور پر استعمال کرنا ہوگا، چکنی جلد کے لیے پودینے کی چائے میں سبز چائے کو شامل کرکے استعمال کریں۔

نیز چہرے اور بالوں کی حفاظت و نگہداشت کے لیے بھی سبز چائے فائدہ مند ہے۔ چہرے سے داغ دھبے دور کرنے کے لیے روزانہ سبز چائے کا چہرے پہ اسپرے کریں۔ چہرے پر پھنسیاں، مہاسے ہونے کی صورت میں آپ اسے ماسک کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ ٹی بیگز کو ٹھنڈے پانی میں بھگو کر اس میں شہد ملا کر ماسک بنا سکتے ہیں۔ سیاہ ہونٹوں کے لیے استعمال شدہ ٹی بیگ کو 5 سے 10 منٹ ہونٹوں کے درمیان دبا کر رکھیں۔ حیرت انگیز نتائج سامنے آئیں گے۔ اس کے علاوہ بالوں میں خشکی دور کرنے کے لیے آپ سبز چائے میں لیموں کا رس ملا کر اسپرے کریں۔

اس کے علاوہ سبز چائے کے اور بھی ڈھیر سارے فائدے ہیں۔ نظام ہضم کو درست کرنے، وزن گھٹانے سے لے کر کینسر کے علاج تک میں سبز چائے فائدے مند ہے روزانہ کم سے کم ایک کپ سبز چائے اپنے معمول میں شامل کریں۔ سبز چائے کا ذائقہ آپ کو تھوڑا سا کڑوا لگ سکتا ہے۔ چائے کو مزے دار کرنے کے لیے آپ اس میں لیموں، شہد یا سبز

الائچی شامل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ دو پیالی چائے کے درمیان کم از کم چار گھنٹے کا وقفہ رکھیں۔ کیونکہ سبز چائے میں کیفین کی موجودگی ہونے کی وجہ سے سبز چائے کا زیادہ استعمال دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتا ہے۔ اس لیے سبز چائے بھی توازن میں استعمال کریں۔ اعتدال اور توازن میں کسی بھی چیز کا استعمال کریں اور صحتمند زندگی گزاریں۔ مضبوط دفاعی نظام اور جسمانی نظام کو بہتر بنانے کے لیے راہ ہموار کرنا یہ آپ کی ذمہ داری ہے اور مکمل طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سبز چائے کو اپنے روزانہ کے معمولات میں شامل کریں جلد ہی آپ اپنی صحت میں بہتری پائیں گے۔

Ansari Asma
House No. 16, Survey No. 374
Madina Park, Near Masood Masjid
Dhule-424001 (M.S)

حسن کی نگہداشت

آنکھوں کی صحت اور دلکشی

خواتین اپنی آنکھوں کی دیکھ بھال کس طرح کرتی ہیں اس کا اندازہ اردگرد کی جلد آنکھوں کی چمک وخوبصورتی اور عمومی صحت سے ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی آنکھوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں یعنی انھیں نہ صرف دھوئیں بلکہ گرد وغبار سے بچا کر رکھیں تاکہ آنکھوں کی چمک اور خوبصورتی برقرار رہے۔ آنکھوں کے اردگرد کی جلد پورے چہرے کی جلد سے زیادہ پتلی اور نازک ہوتی ہے اور اس میں آئل گلینڈ پھیلے ہوتے ہیں ان کی صحت کے لیے

اچھی کریم استعمال کی جاسکتی ہے جس کے استعمال سے اس حصے کی جھریاں خاصی حد تک ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسی خواتین کو کریم کا استعمال ضرور کرنا چاہیے جن کی جلد خشک ہو اور عمر چالیس برس سے زائد ہو۔ آنکھوں کو مسکارا لگاتے وقت خیال رکھیں کہ آنکھیں پوری طرح کھلی نہ ہوں اور آئینے کی جانب براہ راست نہ دیکھیں۔

خوبصورتی میں کلینزنگ کا کردار

باقاعدگی سے جلد کی کلینزنگ چہرے کی جلد کو صحت مند بنانے اور کئی مسائل سے نجات دلانے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ ایک اچھا کلینزر جہاں جلد کو دن بھر کے میل کچیل اور گرد وغبار سے پاک کرتا ہے وہیں اسے

ضروری اجزا فراہم کرکے موئسچرائزر بھی کرتا ہے۔ کاسمیٹکس کی خریداری کے دوران کوئی بھی کلینزر منتخب کرنے سے قبل اس کی تھوڑی سی مقدار ہاتھ کے باہر کی جانب لگا کر اسے ہلکا سا مل کر چیک کرلیں۔ اگر یہ کلینزر آپ کی جلد سے گرد وغبار کو میل کی صورت میں اتار دے تو یہ ٹھیک ہے بصورت دیگر مارکیٹوں میں ایسے کلینزر کی بہتات موجود ہے جو محض کسی بھی عام لوشن کا کام ہی دیتے ہیں اور جلد کی صفائی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ دن بھر میک اپ میں رہنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ باقاعدگی سے جلد کی کلینزنگ کو معمول بنائیں اور اس کے بعد چہرے پر کوئی بھی اچھا موئسچرائزر لگا کر سو جائیں۔ بازاری مصنوعات سے گریز کرنے والی خواتین دودھ یا بالائی میں چند قطرے لیموں ملا کر اس سے بھی کلینزر کا کام لے سکتی ہیں۔ یہ چیزیں جہاں کسی بھی اچھے کلینزر کا کام کرتی ہیں وہیں قدرتی اور خالص ہونے کی وجہ سے کسی قسم کے منفی اثرات بھی مرتب نہیں کرتی۔

حسن وصحت کی حفاظت

اگر آپ ایسا کام کررہی ہیں جس میں آپ کے ہاتھ زیادہ دیر تک گرم پانی میں رہیں تو بہتر ہے کہ ناخنوں اور ہاتھوں کی حفاظت کے لیے ربڑ کے دستانے پہن لیں۔ اپنی جلد کی حفاظت کے لیے اکثر اوقات ہاتھوں پر لگانے والی کریم استعمال کریں۔ جب بھی ہاتھ دھوئیں کریم ضرور لگائیں۔

ہاتھ کے بجائے کاندھے اور کان کے سہارے سے ٹیلی فون پکڑنے کی کوشش نہ کریں اس طرح سے فون پکڑنے سے کان اور کاندھے میں درد شروع ہوسکتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ سر درد شروع ہو جائے یا سر بھاری محسوس ہونے لگے۔ اپنے آپ کو آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ کھانے پینے کی اشیا کو بھی آلودگی سے بچائیں۔ اناج کو پھپھوندی اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لیے ادویات استعمال کی جاتی ہیں یہ ادویات اناج پر لگی رہتی ہیں اور اگر اناج کو صحیح طور سے نہ دھویا جائے تو ایسا اناج کھانے سے انسان بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایلومنیم کے برتن استعمال نہ کریں۔ رنگ کے ڈبوں میں سے بچا رنگ و روغن پھینک دیں کیونکہ بچے ہوئے

رنگ و روغن سے بخارات نکلتے ہیں جو سانس کی بیماری میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ ماحول کو آلودگی سے پاک کرنے کے لیے پودے لگائیں۔ گھر صاف رکھیں۔ ذہن کو تر و تازہ کرنے اور تفریح طبع کرنے کے لیے جب بھی کوئی اچھی فلم دیکھیں تو ہیروئینوں کی نشست و برخاست کے انداز ان کے ملبوسات اور ان کے بولنے کے انداز پر خاص توجہ دیں۔ اس بات کا عہد کریں کہ میک اپ اتارے بغیر نہیں سوئیں گی۔ ہلکی پھلکی ورزش کریں۔ خاص طور پر ٹخنوں کی ورزش ضرور کریں۔ صبح کے وقت جب آفس جائیں تو لفٹ سے نہ جائیں بلکہ سیڑھیوں سے جائیں صبح کے وقت لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے جانا آپ کی ٹانگوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔

خوبصورتی کے لیے بادام

کڑوے بادام جلد کی بیماریوں کا شافی علاج سمجھے جاتے ہیں، خاص طور پر ایگزیما میں، اس مقصد کے لیے کڑوے باداموں کی چند پتیاں لے کر انھیں پیس لیں اس میں تھوڑا سا پانی اور کریم بھی ملائیں، آمیزہ تیار ہونے پر اسے متاثرہ حصوں پر لگائیں، اس کے علاوہ بادام خواتین کی خوبصورتی میں بھی اہم کردار کے حامل ہیں۔ اگر آپ کے چہرے پر چھائیاں ہیں تو بادام ان چھائیوں کو ختم کر کے جلد کی خوبصورتی کو بحال کرتے ہیں،

چشمہ پہننے والی خواتین و حضرات کی ناک پر دونوں اطراف پڑ جانے والے نشانات بھی باداموں اور ناریل کا تیل ملا کر مالش کرنے سے دور ہو سکتے ہیں، باداموں کا پیسٹ اگر بالائی اور گلاب کی کلیوں کے پیسٹ کے ساتھ ملا کر ہر روز چہرے پر لگایا جائے تو یہ بھی حسن کی دلکشی میں اضافے کا باعث ہوتا ہے کیونکہ جلد بالکل صاف و شفاف ہو جاتی ہے اور چہرے پر جھریاں نہیں پڑتیں، کیل مہاسوں کے علاوہ جلد کی خشکی سے بھی نجات مل جاتی ہے نیز چہرہ بھی تازہ اور شگفتہ محسوس ہونے لگتا ہے، گہری رنگت کے حامل ہونٹوں پر بھی اگر بادام اور ناریل کا تیل برابر مقدار میں ملا کر لگایا جائے تو وہ بھی فائدہ مند ہوتا ہے اور ہونٹوں کا رنگ تبدیل ہو جاتا، بادام کا تیل ایک حیرت انگیز موئسچرائزر بھی ہے جسے استعمال کرنے کے بعد آپ کو فریکل کریموں سے نجات مل سکتی ہے۔

چہرے کی خوبصورتی کے لیے متوازن غذا

خواتین اپنے چہرے کی خوبصورتی کے حوالے سے بڑی حساس ہوتی ہیں اگر وہ تھوڑی سی سمجھداری سے کام لیں تو اپنے چہرے کی جھریوں کو دور کر سکتی ہیں۔ چہرے پر جھریاں وٹامن بی اور آئرن کی کمی کی وجہ سے نمودار ہوتی ہیں جس کا علاج ممکن ہے ذرا سی توجہ سے ان کا خاتمہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ختم کرنے کے لیے متوازن غذا کا استعمال اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چونکہ حسن و صحت کا آپس میں گہرا تعلق ہے اسی لیے ماہرین کہتے ہیں کہ جسمانی صحت کے بغیر جو حسن ہوگا وہ مصنوعی ہوگا، معتدل غذا کھانا چہرے کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ پانی کا زیادہ استعمال صحت کے لیے نہ صرف ضروری ہے بلکہ چہرے کو شاداب رکھنے میں بھی اہم ہے۔ صبح ناشتے سے قبل ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک عدد لیموں کا رس ملا کر پینے سے چہرے کی چھائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ جھریاں پڑنا عمر کا تقاضا ہے مگر کچھ خواتین کو چھوٹی عمر میں ہی چہرے پر جھریاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں ایسے میں انھیں چاہیے کہ وہ فوری طور پر اپنے معالج کے پاس جائیں۔

تاثرات

مکرمی..... ہر بار کی طرح خواتین دنیا کا یہ شمارہ بھی اپنی فقید المثال سج دھج، خوبصورت ٹائٹل کور، عمدہ مضامین، شاندار تخلیقات اور بہترین شاعری کو اپنے جلو میں سمیٹے نمودار ہوا۔ اداریے سے لے کر خواتین خبر نامہ تک یہ رسالہ ایک جہانِ طلسم کی طرح لگتا ہے۔ تمام مضامین معلومات سے بھرپور، تمام افسانے تخلیقی ہنر کا پرچم، تمام شاعری سوچوں کے دریچوں کو وا کرنے والی اور تمام مستقل کالم ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

خواتین کو خود مختار بنانے کے دنیا بھر میں صرف اعلانات ہوتے رہتے ہیں لیکن سچائی یہ ہے کہ خواتین کو مضبوط کرنے کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا جاتا۔ 'خواتین دنیا' سچ مچ خواتین کو طاقتور بنانے کے لیے تحریک دیتا ہے۔ رسالے کی خوبی یہ ہے کہ نہ تو یہ صرف تجلک ادبی میگزین ہے اور نہ خالص سیاسی کالم سے بھرپور دانشوری کا پٹارہ۔ یہ رسالہ ایک طرف افکار ونظریات کو ستھرا کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو دوسری طرف گھریلو آرائش و زیبائش اور دسترخوان کو حسین تر بنانے کی ترکیب بتاتا ہے۔

آپ کی سرپرستی میں ادارہ جس برق رفتاری سے چوطرفہ ترقی کر رہا ہے اس کے لیے دلی مبارک باد۔

ممتاز مخدوم، احمد آباد، گجرات

مکرمی! آپ کی سرپرستی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بے شمار کارنامے انجام دیے ہیں لیکن 'خواتین دنیا' کا اجرا تو ایک تاریخ ساز کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اپنی پہلی اشاعت سے ہی اس نے آدھی آبادی کی تخلیقی صلاحیتوں پر منڈراتے بادلوں کو صاف کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز قدم بقدم جاری ہے۔ عموماً خواتین فن کاروں کو 'مانگے کا اجالا' کہا جاتا ہے۔ فی زمانہ ادبی اسٹیج پر جلوہ گر کچھ خواتین اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہیں لیکن خواتین دنیا میں سرکردہ خواتین کے منہ بولتے کارناموں نے اس غلط فہمی کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اب بڑے اعتماد سے خواتین دنیا کو دلیل کے طور پر پیش کر کے خواتین کی ادبی ذہنی، علمی، فکری اور تخلیقی صلاحیتوں پر سوالیہ نشان لگانے والوں کو منہ توڑ جواب دیا جا سکتا ہے۔

یوں تو نومبر کے شمارے کے تمام مشمولات قابل ستائش ہیں لیکن ایک ہلکی سی شکایت بھی ہے۔ اگر رسالے میں صرف خواتین قلمکاروں کے ہی مضامین وتخلیقات شامل کیے جاتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ مرد قلمکاروں کے لیے تو بہت سے رسائل کے دروازے کھلے ہیں خواتین کو ذرا کم ہی رسائل مواقع فراہم کرتے ہیں۔ مصاحب علی صاحب کا مضمون اچھا تو ہے لیکن اگر یہی کسی بہن کے قلم کی کاوش ہوتا تو 'خواتین کے لیے خواتین کے لکھے.........' کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا۔

مسکان ناز کی ثانیہ مرزا سے بات چیت پر مبنی تحریر لائق ستائش ہے لیکن یہ مضمون بہت سے گوشوں کو تشنہ چھوڑ گیا۔ اگر ان کی زندگی کے مزید پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا تو ثانیہ پر لکھا گیا یہ مضمون کافی وقیع ہو سکتا تھا۔ تمام شاعرات کی غزلیں اور نظمیں بہت عمدہ تھیں۔ افسانے بھی اچھے رہے لیکن اس گوشے پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

عروسہ نعیم، ممبئی

مکرمی! خواتین دنیا کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں بھی بلا کی دلفریبی، انفرادیت اور سج دھج نظر آئی۔ یہ شمارہ سرورق سے ہی متاثر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ جیسی جیالی، بہادر اور آہنی مزاج لڑکی کو ٹائٹل پر سجا کر واضح طور پر آج کے سماج میں ٹھٹھری، سہمی اور ڈری سہمی لڑکیوں کو خود شناسی کی ترغیب دینے کی شاندار کوشش کی گئی ہے۔

خواتین کو خود مختار بنانے کی یہ عملی کوشش ہے جس کے لیے ادارہ خواتین دنیا اور قوم کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کا مستحق ہے۔

مذکورہ شمارے کے تمام مشمولات میں سب سے زیادہ شعری گوشے نے مجھے متاثر کیا۔ علامہ اقبال کی معروف نظم۔ فاطمہ بنت عبد اللہ، کا یہ شعر

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی خوابیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں

بیدار مغز خواتین میں توانائی پیدا کرتا ہے اور نا آشنائے زمانہ لڑکیوں میں بجلیاں پیدا کر دیتا ہے ڈاکٹر بھاؤنا، اوشا کرن، ہما شہناز کی غزلیں اور بلقیس جمال بریلوی کی نظم 'فغان یاس' بہت متاثر کن لگیں۔ ان غزلوں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ نئی نسل بڑی محنت سے غزل کے فن کی آبیاری کر رہی ہے۔

تمام قلمکاروں اور جملہ فنکاروں کو ہزار سلام اور آپ کو دلی مبارکباد۔

عقیلہ عندلیب، بھیونڈی، مہاراشٹر

مکرمی! 'خواتین دنیا' شاید دنیا کا پہلا ایسا ماہنامہ ہے جو اپنی ابتدا سے ہی معیار کے نئے سنگِ میل نصب کرتا جا رہا ہے۔ اس بار کا شمارہ کئی اعتبار سے 'تاریخی ساز' کہا جا سکتا ہے۔ اس میں فاطمہ بنت عبد اللہ پر علامہ اقبال کی معرکۃ الآرا نظم تو لاجواب ہے ہی فاطمہ نقویہ پر مصاحب علی کا مضمون بہت عمدہ اور تحقیق کے نئے دروا کرتا ہے۔ فریدہ تبسم کا مضمون 'بدر النساء بیگم اور آغا حیدر' خاصے کی چیز ہے خود مختاریت کی راہ پر سعودی خواتین، ایم اے کنول نے بہت معلومات افزا تحریر کیا ہے۔ علاوہ ازیں غزال ضیغم، انور نزہت، غوثیہ مظفر حسین بیگم، فاطمہ پروین کی کہانیاں بھی بہترین ہیں۔ ہما شہناز، اوشا کرن اور بلقیس جمال بریلوی کی شعری تخلیقات بھی عمدہ ہیں صحت، لذیذ پکوان اور آرائش و زیبائش جیسے مستقل کالم ہر بار کی طرح اس بار بھی لاجواب رہے۔ آپ کی اداریہ تحریر تو رسالے کی جان کہی جا سکتی ہے۔ 64 صفحات پر پوری دنیا سجانے کے لیے آپ کو ایک بار پھر دل سے مبارک باد۔

مکرمہ مسعود، لال باغ روڈ، بنگلور، کرناٹک

مکرمی! خواتین دنیا اپنی ابتدا سے ہی عالمی معیار کا خواتین ماہنامہ بن گیا ہے۔ اس کا ایک ایک صفحہ معیاری صحافت کا ایک سنگِ میل نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ خواتین دنیا قدم قدم پر ایسے نشانات چھوڑتا جا رہا ہے جس پر آنے اپنی منزلیں تعمیر کریں گے۔ یہ ماہنامہ خواتین کے لیے ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت آمیز رشک ہوتا ہے کہ مرد قلمکار یہاں بھی اپنی رسائی کر ہی لیتے ہیں۔ خواجہ عبد المنتقم کی قانونی معلومات بہت اعلیٰ اور کارآمد ہیں لیکن یہ کالم کسی خاتون وکیل سے لکھوایا جاتا تو مزید بہتر ہوتا۔ اسی طرح مصاحب علی صاحب نے جو مضمون لکھا وہ کسی خاتون اسکالر بھی لکھوایا جا سکتا تھا خیر تازہ شمارے میں جن خواتین نے اپنی عرق ریز تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ان میں غزال ضیغم، فریدہ تبسم، سیدہ نوشاد بیگم محمود، انور نزہت، غوثیہ مظفر حسین بیگم، صبیحہ انور، ناظمہ پروین وغیرہ کے نثری شہ پارے اور اوشا کرن، بھاؤنا، ہما شہناز کی شعری کاوشیں کافی متاثر کرتی ہیں۔ ان سب کو میری طرف سے ڈھیروں دعائیں اور لاکھوں مبارک باد۔

انجم صدیقی، ممبرا۔ مہاراشٹر

مکرمی! 'خواتین دنیا' کی اشاعت کے لیے دلی مبارکباد۔ مجھے ایک دوست کے توسط سے ماہ نومبر کا شمارہ ملا۔ شروع سے آخر تک پڑھا۔ ہر صفحہ اعلیٰ و معیاری لگا۔ آجکل ادبی صحافت کا معیار بتدریج گرتا جا رہا ہے۔ ادب کے نام پر خام تخلیقات مستند ادبی رسائل میں نظر آ جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس بھیڑ چال سے خواتین دنیا کو محفوظ رکھا ہے۔ دوسرے آپ نے مذکورہ ماہنامے کو صرف ادب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں سماجی مضامین اور تازہ دم خواتین کے کارناموں سے رسائل کو مزین کر کے ایک مکمل فیملی میگزین بنا دیا ہے۔ اردو دنیا میں ایسے رسالے اب نظر نہیں آتے۔

میں ذاتی طور پر غزال ضیغم کے افسانوں کی بڑی مداح ہوں۔ ان کے افسانوں میں ایک طرف ہمارا ماضی اپنی روشن شبیہہ لیے نظر آتا ہے تو دوسری طرف نئی تہذیب بھی مثبت چہرہ دکھاتی ہے۔ نومبر کے شمارے شامل میں ان کی کہانی 'فیڈ آؤٹ فیڈ ان' ان کے ساتھ دبدبے کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ معروف افسانہ نگار انور نزہت کی باجی، غوثیہ مظفر حسین بیگم کی سوکن پر بیٹی ناظمہ پروین کی شہزادی بھی لیک سے ہٹ کر ہیں۔ پروین طلحہ کی کہانی 'بٹی ہوئی ماں' کا صبیحہ انور نے بہت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ ہما شہناز کی غزل بہت اچھی لگی۔ امید ہے کہ اگر انھوں نے اپنی شاعری کو مشاعروں سے بچا کر رکھا تو وہ ایک نئی پروین شاکر کے روپ میں ابھر سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں مستقل کالم باورچی خانہ، آرائش و زیبائش اور صحت بھی بہت اچھے ہیں۔ میری طرف سے ایک بار پھر مبارک قبول کریں۔

نوشتہ خانم، بڑودہ، گجرات

خواتین خبرنامہ

ویٹ لفٹنگ :22 سال بعد ہندستان کو عالمی چیمپئن شپ میں ملا طلائی تمغہ، میرابائی چانو نے یہ کارنامہ دیا انجام

پنہوم، (کیلی فورنیا): ہندستان کی میرابائی چانو نے 22 برسوں کے طویل انتظار کے بعد ویٹ لفٹنگ عالمی چیمپئن شپ میں پہلا سونے کا تمغہ حاصل کرکے ملک کا سر فخر سے بلند کیا ہے۔ میرابائی نے خواتین کے 48 کلوگرام زمرے میں خطاب کی دعویدار تھائی لینڈ کی شونیا سوکچاروِن کو شکست دے کر طلائی تمغہ پر اپنا قبضہ جمایا اور عالمی چیمپئن شپ میں طلائی تمغہ جیتنے والی دو دہائیوں میں ہندستان کی پہلی خاتون ویٹ لفٹر بھی بن گئی ہیں۔

ہندستانی ریلوے کی ملازم چانو نے اسنیچ میں 85 کلوگرام اور کلین اینڈ زرک میں 109 کلوگرام وزن اٹھایا اور 194 کلوگرام وزن اٹھا کر

انہوں نے سونے کا تمغہ حاصل کیا اور ساتھ ہی نیا قومی ریکارڈ بھی بنایا۔ میرابائی کے لئے یہ یقیناً بہت بڑی کامیابی ہے۔ پوڈیم پر پہلے مقام پر کھڑے ہونے پر وہ بہت جذباتی نظر آرہی تھیں۔ اس سے قبل اولمپک کانسہ کا تمغہ حاصل کرنے والی کرنم ملیشوری نے 1994 اور 1995 میں دو بار عالمی ویٹ لفٹنگ چیمپئن شپ میں طلائی تمغے جیتے تھے۔ اس کے علاوہ سال 2000 میں ملیشوری نے اولمپک تمغہ جیتا تھا جو ہندستان کی خاتون ایتھلیٹ کا کسی بھی کھیل میں پہلا اولمپک تمغہ بھی تھا۔

برازیل میں ہوئے ریو اولمپک میں حالانکہ چانو کی کارکردگی کافی مایوس کن رہی تھی اور وہ اپنی تینوں ہی کوششوں میں طے شدہ وزن نہیں اٹھا پائی تھیں۔ کل 12 ویٹ لفٹروں میں چانو ان دو کھلاڑیوں میں رہی تھیں جو تینوں ہی کوششوں میں کامیاب رہی تھیں جو انکے کیریئر کی بھی انفرادی طور سے سب خراب کارکردگی تھی۔ عالمی چیمپئن شپ میں چانو سے شکست کھا کر دوسرے نمبر پر رہیں سوکچاروین نے کل 193 کلوگرام وزن اٹھا کر کانسہ جیتا۔

میرابائی نے طلائی تمغہ جیتنے کے بعد کہا میں کنوینشن سینٹر میں بہت ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ لیکن اپنی تینوں کوششوں میں انہوں نے بہترین کارکردگی پیش کرتے ہوئے کل 194 کلوگرام وزن اٹھایا اور محض ایک کلوگرام کے فرق سے تھائی کھلاڑی کو سونے کا تمغہ لینے سے پیچھے چھوڑ دیا۔

ایشین کپ خطاب جیتنے والی خاتون ہاکی ٹیم کا شاندار استقبال

نئی دہلی، 07 نومبر (ایجنسی) ایشین کپ جیتنے والی خاتون ہاکی ٹیم کا ایشیا کپ میں 13 سالوں کے طویل وقفے کے بعد خطاب جیتنے پر پیر کو وطن واپسی پر شاندار استقبال کیا گیا۔ ایشیا کپ فاتح کے لیے اندرا گاندھی انٹر نیشنل ہوائی اڈے پر سینکڑوں شائقین موجود تھے، جب ہندوستانی خواتین کی ہاکی ٹیم گزشتہ رات گھر واپس آئی تھی۔ کھلاڑیوں کو پھولوں سے لاد دیا گیا اور پرستاروں نے کھلاڑیوں میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ ایئرپورٹ کے باہر بڑے تعداد میں میڈیا اور پرستار موجود تھے۔ ٹیم کے ٹرافی کے ساتھ ایئر پورٹ کے باہر آنے پر کیمروں کی فلیش چمکنا شروع ہوگئی۔ ہندوستانی

خاتون ہاکی ٹیم کی کھلاڑی اپنے اس والہانہ استقبال سے کافی متاثر نظر آئیں۔ اس موقع پر اخباری نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ٹیم کی سرکردہ گول کیپر سویتا نے کہا کہ وہ اپنی ٹیم کے اس شاندار استقبال سے بہت مسرور ہیں۔ اس موقع پر ایشیا کپ جیتنے اور عالمی کپ کے لیے کوالیفائی کرنے کو قابل فخر لمحہ قرار دیتے ہوئے ٹیم کی کپتان رانی نے کہا کہ

ٹیم میں شامل تمام کھلاڑیوں نے اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرتے ہوئے خطاب حاصل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اعلیٰ معیاری ٹورنامنٹ تھا اور ٹورنامنٹ کے مکمل وقفہ کے دوران ہم نے اپنے کھیل کے معیار کو گرنے نہیں دیا۔ یہ جیت ہماری پورے سال کی محنت اور ہمارے کوچنگ عملے کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس موقع پر ٹیم کے کوچ ہریندر سنگھ نے کہا کہ انھوں نے گزشتہ مہینے ٹیم کے چیف کوچ کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ انھوں نے کھلاڑیوں کے کھیلنے کے انداز اور طرز میں زیادہ تبدیلی نہیں کی بلکہ انھوں نے ان کی سوچ کو بدلنے پر کام کیا۔ انھوں نے کھلاڑیوں کو یہی تاکید کی کہ وہ سب کچھ فراموش کر کے مثبت ہاکی پر دھیان دیں۔ اچھے نتائج خود بخود برآمد ہوں گے۔ واضح رہے کہ ہندوستانی ٹیم اپنی اس کامیابی کے سبب عالمی درجہ بندی میں سرفہرست دس ٹیموں میں شامل ہوگئی ہے۔ ہاکی انڈیا نے ایشیا کپ جیتنے والی 18 رکنی ہندوستانی ٹیم کی ہر کھلاڑی اور ٹیم کے کوچ کو ایک ایک لاکھ روپے انعام دینے اس کے علاوہ کھیل عملے کے ارکان 50-50 ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔

سندھو ہانگ کانگ کے سیمی فائنل میں

کولون (ہانگ کانگ)، 24 نومبر (یو این آئی) اولمپک میڈلسٹ اور ملک کی اسٹار خاتون شٹلر پی وی سندھو نے جمعہ کو پانچویں سیڈ جاپان کی اکانے یاما گوچی کو 12-21، 19-21 سے شکست دے کر چار لاکھ ڈالر کی انعامی رقم والے ہانگ کانگ اوپن سپر سیریز بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے سیمی

فائنل میں داخلہ حاصل کرلیا۔ دنیا کی تیسرے نمبر کی کھلاڑی سندھو نے یاما گوچی سے یہ مقابلہ 37 منٹ میں جیت لیا۔ ہندوستانی کھلاڑی کا سیمی فائنل میں اب چھٹے تھائی لینڈ کی رتچانوک انتانون کے ساتھ مقابلہ ہوگا جن کے خلاف سندھو کا 4-1 کیریئر ریکارڈ ہے۔ سندھو اور یاما گوچی کے درمیان یہ مقابلہ کافی ہائی پروفائل مانا جارہا تھا۔ دونوں کے درمیان یہ چھٹا کیریئر مقابلہ تھا جس میں اب سندھو نے اپنا کیریئر ریکارڈ 2-4 پہنچا دیا ہے۔ سندھو نے اس جیت کے ساتھ ہی جاپانی کھلاڑی سے اس سال فرانسیسی اوپن کے سیمی فائنل میں شکست کا بدلہ بھی چکا لیا۔ ٹورنامنٹ میں واحد ہندوستانی کھلاڑی بچیں سندھو کو گزشتہ ہفتہ چائنا اوپن کے کوارٹر فائنل میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن یہاں انھوں نے اس قفل کو توڑا اور سیمی فائنل میں جگہ بنالی۔ ہندوستانی کھلاڑی نے میچ میں اچھی شروعات کی اور جلد ہی 2-6 کی برتری حاصل کرلی۔ سندھو نے یہاں سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنی برتری کو 4-10، 8-13، 9-15 اور 11-18 پہنچاتے ہوئے پہلا گیم آسانی سے 12-21 پر ختم کردیا۔

دوسرے گیم میں سندھو نے مسلسل تین پوائنٹس لیے اور 0-3 سے آگے ہوگئیں۔ یاما گوچی نے مسلسل چار پوائنٹس لے کر 3-4 کی برتری بنائی۔

شاراپووا کے سابق کوچ سے تربیت لیں گی جوہانا کونٹا

لندن (یو این آئی) برطانیہ کی نمبر ایک خاتون ٹینس کھلاڑی جوہانا کونٹا نے امریکہ کے مائیکل جوائس کو 2018 کے نئے سیشن کے لیے اپنا کوچ مقرر کیا ہے۔ وہ اکتوبر میں اپنے کوچ بیلجیم کے ویم فیسیٹ سے الگ ہوگئی تھیں۔ 26 سال کی کونٹا کی سال 2017 میں کارکردگی بہترین رہی اور انھوں نے سڈنی انٹرنیشنل اور میامی اوپن میں خطاب جیتے اور کیریئر کی بہترین رینکنگ پر پہنچ کر دنیا کی چوتھے نمبر کی کھلاڑی بن گئیں۔ لیکن آخری سیشن میں چوٹ کی وجہ سے وہ درجہ بندی میں پھسل گئی ہیں اور ڈبلیو ٹی اے فائنلس میں جگہ نہیں بنا سکیں۔ برطانوی ٹینس کھلاڑی نے امریکہ کے 44 سالہ جوائس کو اپنا کوچ مقرر کیا ہے جو سابق نمبر ایک کھلاڑی ماریا شاراپووا کے کوچ رہ چکے ہیں اور انھیں دو گرینڈ سلیم تک پہنچانے میں مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ موجودہ سال میں وکٹوریہ ازارینکا کی کوچنگ ٹیم کا بھی حصہ رہے۔ انھوں نے گزشتہ ہفتے ہی بیلا روسی کھلاڑی کا ساتھ چھوڑا ہے۔ کونٹا نے ایک بیان میں کہا ’’میں بہت خوش ہوں کہ مائیکل جوائس کے ساتھ میں 2018 سیشن کا آغاز کروں گی۔ مائیکل بہترین کوچ ہیں۔ موجودہ سال کمال کا رہا تھا اور امید ہے کہ آگے کا سال اور بھی اچھا ہوگا۔‘‘

برطانوی کھلاڑی اپنے نئے سیشن کا آغاز برسبین انٹرنیشنل سے کریں گی جو 31 دسمبر سے کھیلا جائے گا۔ اس کے علاوہ چیک جمہوریہ کی باربورا اسٹرائکووا نے ہم وطن ڈیوڈ کوٹجا کو اپنا نیا کوچ منتخب کیا ہے۔ اسٹرائکووا نے اکتوبر میں لنج اوپن میں خطاب جیتا تھا۔ وہ اس سال کوچ ٹامس کروپا سے الگ ہوگئی تھیں۔ 31 سالہ چیک کھلاڑی آکلینڈ کلاسک سے نئے سیشن کا آغاز کریں گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت
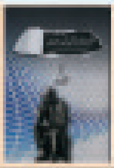
مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)
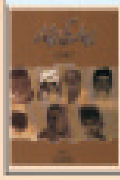
مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہار گلشن کشمیر (جلد اول و دوم)

مرتب و مولف: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ ریہ
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300 روپے

دیویندر ستیارتھی
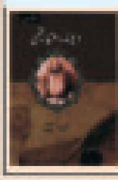
مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

علی سردار جعفری

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی
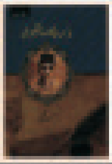
مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)
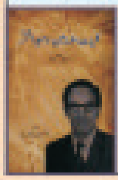
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: 115/- روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)
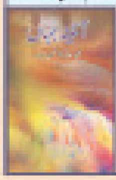
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)
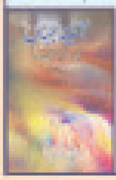
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
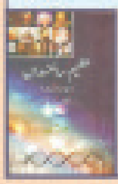
مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت: 32/- روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)
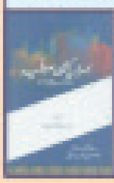
مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: 335/- روپے

انتخاب سخن (جلد اول) سلسلۂ شاہ حاتم
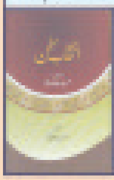
مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: 175/- روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر
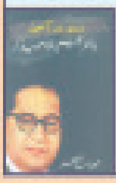
مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے
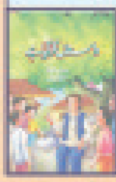
مصنف: رتن سنگھ، مصور: فخرالدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فخرالدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی
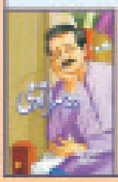
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فخرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2018, Vol. 02, Issue: 1 RNI. No. DELURD/2017/74026
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

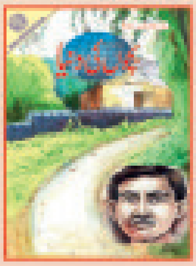

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025